باب۔سوم

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک کی نمائندہ خودنوشتوں میں نفسیاتی کشمکش

''یادوں کی بارات''۱۹۷۰ء(جوشؔ ملیح آبادی)

عفریت،خبیث، دیو،شیطاں درویش،اقطاب،امام،مرسل ،یزداں
گیتی ،گردوں،بہشت،دوزخ،اعراف
یہ سب ہیں میرے دل میں خروشاں وتپاں
(جوشؔ)

جوشؔ جیسی عبقری اور پہلو دار شخصیت کے نفسیاتی مطالعے کے لیے ''یادوں کی بارات'' سے بہتر کوئی اور دوسرا ماخذ نہیں ہوسکتا۔اس خودنوشت میں انکی تہہ دار شخصیت کا ہر رخ بے حجاب نظر آتا ہے۔ پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل پوری کتاب مختلف نفسیاتی کشمکشوں اور تضادات کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کی متضاد اور نفسیاتی کشمکش کی حامل شخصیت کا اس سے بین ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے کلام کے مجموعوں کے نام بھی تضاد اور کشمکش کا سراغ دیتے ہیں۔مثلاً ''خار وگل''، ''شعلہ و شبنم''، ''عرش وفرش''، ''جنونِ حکمت''، ''فکر ونشاط''، ''سموم وسبو'' وغیرہ۔یہی کشمکش اس کتاب کی وجہِ تخلیق کے پس پشت بھی کارفرما دکھتی ہے۔چنانچہ جوشؔ کے بقول اس کتاب کو چار مرتبہ لکھا گیا تھا۔یہ تو انہیں اپنی موت کا اندیشہ ستا رہا تھا،اور انہوں نے اس کتاب کے مسودے کو شائع ہونے کے لیے دے دیا ورنہ وہ اس کتاب کو پانچویں مرتبہ بھی لکھنے کا سوچ رہے تھے۔

اُردو میں جتنی بھی خودنوشتیں منظرعام پر آچکی ہیں ''یادوں کی بارات'' ان میں نفسیاتی اعتبار سے اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ اس میں سب سے زیادہ نفسیاتی کشمکش اور گرہوں کی نقاب کشائی ملتی ہے۔ وہیں دوسری طرف اس کتاب کی صحت پر بھی یہ الزام ہے کہ اس میں اصلیت تو بقدر نمک ہے باقی مبالغہ، مرچ،افسانہ طرازی اور دروغ بیانی ہے۔خود اس کتاب کی صداقت پر سوالیہ نشان،اس لیے بھی لگتا ہے کیونکہ مصنف خود ہی آغاز کتاب میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ انکا حافظہ بہت کمزور ہے اور مزید کسر نکالنے

کے لیے وہ اس دعوے کے حق میں اپنی کمزور یادداشت کے قصّے بھی قلمبند کرتے ہیں۔ ایسے میں خودنوشت میں درج ہر واقعے کی صداقت پر آنکھ بند کر کے یقین کرنا خاصا دشوار عمل بن جاتا ہے۔ یوں مصنف قاری کو بھی ذہنی اُلجھن میں گرفتار کر دیتا ہے۔ اس لیے حتمی طور سے ان کی ذات کے حوالے سے کوئی رائے قائم کرنا خاصا پیچیدہ کام ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ بھی ہے کہ ایسی بوقلمونی طبیعت، انکی پہچان بھی ٹھہرتی ہے۔ بہر صورت! خودنوشت کے مطالعہ سے جن نفسیاتی الجھنوں، کشمکشوں اور تضاد بیانیوں کا قاری بار بار احساس کرتا ہے وہ نرگسیت، خود پر طنز، خودنمائی، انسان دوستی و نسلی برتری، جنسی نفسیاتی دباؤ اور ارتفاع، انانیت، لادینیت، مذہبی محاسبہ اور مخمصہ، زہد و رندی، تعقل پسندی اور اوہام پرستی، ترک وطن اور وطن کی محبت، خشم ناکی اور رقیق القلبی، ماضی پرستی اور حال سے بیزاری، مبالغہ آمیزی اور طنز و استہزا، عشق بازی اور ازدواجی ناآسودگی، ایڈی پس گرہ اور مساکیت کی کشاکشی اور تلون مزاجی کی متنوع اقسام کی کشمکشیں ہیں۔ یہاں یہ بات اہم ہے کہ ان باتوں کا انہیں خود بھی احساس ہے۔ اس لیے وہ خود کو مجموعہ اضداد کہتے ہیں۔ درج ذیل قول میں جوشؔ جو تبصرہ خود اپنے بچپن کے حوالے سے کرتے ہیں، اس کا اطلاق صرف انکے بچپن پے ہی نہیں بلکہ خودنوشت کی روشنی میں پوری عمر پر بھی ہوتا ہے۔ خودنوشت میں یہ اعتراف نامہ انکے ہاتھوں یوں درج ملتا ہے:

> ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بچپن میں کیا تھا، شعلہ تھا کہ شبنم، حدید تھا کہ حریر، نوک خار تھا کہ برگ گل، خنجر تھا کہ ہلال، چنگیز خان کا علم بردار تھا کہ ''رحمتہ العالمین'' کا پرستار۔'' (۱)

شبیر سے جوشؔ تک کے سفر کے پیچھے کون سے عوامل و محرکات کارفرما رہے ہیں اور یہ تلون مزاجی کیونکر واقع ہوئی! آئیے اس پر کچھ نگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے جو سب سے پہلی اہم بات ہے وہ انکے ماحول کا ذکر ہے، جس میں انکی پرداخت ہوئی تھی۔ جوشؔ کا تعلق اس گھرانے سے تھا جو شعر و شاعری کا گہوارہ تھا۔ درباروں سے اس خاندان کی خاص راہ و رسم تھی، شاعری انکا خاندانی پیشہ اور فن تھا۔ والد، دادا، پردادا، سب کا شغف اس فن کی طرف رہا تھا۔ ادبی ماحول ہر چار سُو تھا۔ جاہ حشم والے خاندان میں ہر طرح کی آسائشیں انہیں بہم رہتی تھیں۔ ایسے ماحول میں انکی طبیعت کا شاعری اور رومان کی طرف مائل ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ بالفاظ دیگر شاعری انکو ورثہ میں ملی تھی۔ خودنوشت میں اپنے

چار بنیادی میلانات کا جب وہ تذکرہ کرتے ہیں تو ایک اہم میلان 'شاعری' کے متعلق وہ گفتگو کرتے ہوئے کچھ یوں اظہار خیال فرماتے ہیں:

''ذرا سوچیے تو وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو اور دادا بھی شاعر ہو، حقیقی ماموں بھی شاعر ہو، جس کی ماں مرزا غالبؔ کی قرابت دار ہو، اور اردو فارسی کے اشعار برمحل سناتی رہتی ہو، جس کا انا خالص لکھنوی ہو اور رات کے وقت:
''کھلی ہے کنج قفس میں میری زبان صیاد'' کی لوری دے دے کر سلاتی ہو، جس کے گھر میں آئے دن لکھنؤ کے شاعر آتے ہوں اور تیسرے چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعرا کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا۔''(۲)

فطرتی طور خود کے شاعر ہونے پر وہ ایک اور جگہ یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

''میں نے شاعر بننے کی تمنا کبھی نہیں کی، بلکہ شعر خود خواہش آن کرد کہ گرد دفنِ ما۔ میں شاعری کے پیچھے نہیں دوڑا، شاعری نے خود میرا تعاقب کیا، اور نو برس کی عمر میں ہی مجھ کو پکڑ لیا۔''(۳)

جوشؔ اس زمانے اور ماحول کی پیداوار ہیں جس میں شعر و شاعری کا بگل ہر طرف بج رہا تھا۔ یہ وہ دور ہے جس میں اقبالؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور اکبرالہ آبادی اردو کی عظمت رفتہ بحال کرنے میں محو تھے اور شعر و ادب کے افق پے جگمگا رہے تھے۔ دوسری طرف فراقؔ گورکھپوری، فانیؔ بدایونی، یگانہؔ چنگیزی، حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مرادآبادی، مجازؔ، آغا قزلباشؔ جیسے شاعر شعر و سخن کو تمکنت و وقار بخش رہے تھے۔ ایسے شعری ماحول میں انکی طبیعت کو کیوں نہ تحریک ملتی؟ علاوہ بریں اس عہد میں سیاسی اتھل پتھل بھی زور و شور سے ہو رہی تھی۔ اشتراکیت کا پرچار ہو رہا تھا، سامراجی قوتیں گھٹنے ٹیک رہی تھیں۔ گاندھی جی اہنسا کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ شہنشاہیت کی دیواریں منہدم ہو رہی تھیں۔ سیاسی انقلاب کی صدائیں ہر جانب سے سنائی دے رہی تھیں۔ مغلیہ اور انگریز سلطنتوں کے عروج و زوال کے مناظر آنکھوں میں رقص کر رہے تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ایسا انقلابی اور پُر جوش ماحول جوشؔ کو جوشؔ کیوں نہ بناتا؟ اسی طرح وراثت Heredity کے عناصر اور اجتماعی لاشعور بھی ہر انسان کی شخصیت کی

تعمیر وتخریب میں کارفرما رہتے ہیں۔زمیندارانہ اور جاگیردارانہ کج کلاہی ان کے خاندان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی،خودنوشت کے مطالعہ کے دوران بار بار جوشؔ کا اپنے خاندانی حشمت وشوکت کا تذکرہ کرنا اورنسلی افتخار میں مبتلا دکھائی دینا اسی سوچ کو ظاہر کرتا۔ برہنہ گفتاری ،انانیت ،جنسی کج روی ،غصّہ ورحم، شیعت کی طرف میلان جیسی خصوصیات کوانھوں نے وراثتاً حاصل کیا تھااورعیش پسندی،سیاست وانسان دوستی،دیوانگی وسرشاری ،فرنگ کی نفرت اوراودھ کے شاہان سے لگاؤ جیسے عناصر ماحول کی دین تھے۔ان عناصر سے جوشخصیت ابھرکرسامنے آئے گی اسے مجموعہ اضدادتو ہوناہی تھا۔ پروفیسر احتشام حسین جوشؔ کی اس متضادشخصیت کے بارے میں یوں اظہارخیال فرماتے ہیں:

> ''جوش کا سینہ کتنے متضاداورمتصادم عناصر کی جولان گاہ ہے کیاانکی شخصیت میں ان کا اظہار نہیں ہوگا؟''(۴)

خودنوشت کے توسط سے جوشؔ میں شعلہ وشبنم جیسی خصوصیات بچپن سے ہی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اپنے لڑکپن کی غیظ وغضب کی حامل طبیعت کا ایک واقعہ خودنوشت میں رقم کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میرے غیظ وغضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اگر ذرا بات پر بگڑ جاتا تو بید مار مار کران بے چاروں کی کھال کھینچ لیا کرتا تھااور جب ماسٹر بن کراپنا پڑھاہوا سبق،ساتھ کے بچوں کو پڑھاتا اور دوسرے دن ان سے آموختہ دہرواتا اور وہ دہرا نہ سکتے تو ان کو، ڈنڈوں سے پیٹتا،اوران کے کاندھوں پرسوار ہوکر،ان کو ٹٹّوؤں کی طرح اس قدر سرپٹ دوڑایا کرتا تھا کہ ان کی جانوں پر بن جایا کرتی تھی۔''(۵)

جوشؔ جس طرح شعلہ مزاج رکھتے تھے ایسے ہی شبنم مزاجی بھی ان میں پائی جاتی تھی۔اپنے ایک ملازم بندے علی خان سے جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اسے پیسوں کی احتیاج ہےتو وہ اپنی ماں کی چمپا کلی جوتین ،سواتین ہزار کی تھی چراتے ہیں اور بندے علی خان کودے آتے ہیں۔کتاب میں انکی شبنم مزاجی کا یہ قصہ ایسے الفاظ میں مذکورملتا ہے:

> ''بندے علی خاں کی زبان سے جب میں نے یہ بات سنی،میرا دل دھڑکنے لگا......سوچنے لگا کہ ان کی جان کیوں کر بچاؤں۔میں نے چمپا کلی جھٹ سے اٹھا کر......اورسب کی نظر بچا

کر چھپا کلی...... بندے علی خان کے حوالے کی، ان کے دل کی کلی کھل گئی......اور دونوں ہات
اٹھا کر، انھوں نے مجھے دعائیں دینا شروع کر دیں۔''(۶)

اسی طرح کبھی وہ اپنے ایک بوڑھے سپاہی حیدر خان کی حالت زار پر رحم کھا کے گل زار بوا کی نظر سے چھپا کر بالائی کے لیے پیالے پہنچاتے نظر آتے ہیں تو کبھی اپنی بوڑھی کھلائی عباس خانم کی طبیعت بگڑنے پر پیر دباتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے اس نوعیت کے مزاج کی صورت کو جب وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو گویا لگتا ہے کہ سارے جہاں کا درد، جوشؔ کے جگر میں ہے:

''جب کسی مفلس کے گھر کے چولھے میں آگ روشن نہیں ہوتی میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے، جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں، میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں، جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے، میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں، اور جب کسی گھر سے بھی جنازہ نکلتا ہے، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔''(۷)

انسان دوستی کا پہلو ملاحظہ کرنے کے بعد انکے دوسرے رخ کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ جہاں وہ اپنی ہوس اور طمع کے ہاتھوا گرفتار ہو کے یہ سبق بھول جاتے ہیں جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ خودنوشت انکے آخری دور کی تخلیق ہے۔ لیکن باجود اسکے وہ کسی پشیمانی، کسی حیا و اخلاقی ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے بڑھاپے میں بھی عورت کے تئیں ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور چٹخارے لیتے ہوئے مزے لیتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مخالف صنف کو محض شہوت کا آلہ کار ہی سمجھتے ہیں اور کوئی وقعت عورتوں کی، انکے یہاں نہیں ہے۔ چند حوالے بطور نمونہ انکی جنس آمیز ذہنیت کی تائید میں ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

''خدا خدا کر کے اب پچھلے پہر کوئی چودہ برس کی پانچویں طوائف مجرے کے واسطے آئی۔ ......اس کی جوانی کا سیب ہنوز پال سے باہر نہیں نکلا تھا......اس کی ناک کی نتھ گواہی دے رہی تھی کہ اس کا پنڈا ابھی تک کنوارا ہے اور سینے پر اس کے آبی آنچل کے نیچے گویا ایک بلوا سا ہو رہا تھا......لیکن اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب اس مجرے کی یاد آ جاتی ہے تو میرے جھریوں بھرے ہاتھ کی پشت پر اس کی پشواز کا دامن سرسرانے اور کروٹیں ہی لینے لگتا ہے۔''(۸)

اسی طرح اپنے ایک سفر کی روداد کو خودنوشت میں پیش کرتے ہوئے وہ ایک لڑکی جسکا نام انہوں نے ر۔کماری رکھا ہے اور جو سوار کی حیثیت سے ٹرین میں چڑھی تھی، کو جنسی طور ہراساں کرنے اور اسکے بارے میں منفی خیالات رکھنے کا بھی ذکر کرتے ہیں، جو یقیناً باعث شرم ہے اور انکی جنسی کج روی کو طشت از بام کرنے کے لیے کافی ہے۔ بطور نمونہ ایک اقتباس یہاں درج کیا جا رہا ہے:

''میں دعائیں مانگنے لگا کہ اب کوئی دوسرا مسافر آخر تک نہ آئے......تیسرے جام کا ایک گھونٹ پینے کے بعد میں اپنا بستر درست کرنے کے بہانے سے **بالقصد** لڑکھڑاتا ہوا اٹھا، اور یہ ظاہر کیا کہ میرے جسم کا توازن بگڑ گیا ہے، اور جب تکیے سیدھے کرنے کو جھکا تو ایک جھٹکے کے ساتھ، اس کی طرف اس طرح جھک گیا کہ میرے دونوں ہات اس کے سینے پر جا کر ٹک گئے۔''(۹)

اپنے اخلاقی جرائم پر شرمندگی اور ندامت تو درکنار جوشؔ اپنی اس ہوس پرستی، انسانی حرمت و وقار کی ردا چاک کرنے کی اور دوسروں کے جذباتوں کے ساتھ کھیل کر انہیں سرِ راہ چھوڑنے کی تاویل بھی پیش کرتے ہیں:

''اب رہی یہ بات کہ میں نے قیس و فرہاد کے مانند ایک لیلیٰ اور شیریں سے عشق کرنے کے بعد اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی ایک کا ہو کر رہ جانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک یہ صورت حال معشوقیت کو زوجیت کے سیلے تہہ خانے میں قید کر دینے کی بدمذاقی، بہتے پانی کو بند کر دینے کی عفونت انگیزی، جذبات نو بہ نو کا احتباس، قانون تغیرات کی خلاف ورزی، ذوقِ تنوع کی بے حوصلگی، تصور کی تہی دستی اور تخیل کا افلاس ہے۔''(۱۰)

ایسے ہی اپنی ہوس پرستی کا دفاع کرنے کے لیے وہ عشق اور شہوت کی تعریفیں ہی بدل دیتے ہیں، یہ طرفۂ لطیفہ بھی ملاحظہ کریں:

''شہوانی کے علاوہ عشق اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے اور جسے پاک عشق کہتے ہیں وہ جذبۂ عشق کا ایسا تموج ہوتا ہے کہ آدمی سُن ہو کر رہ جاتا ہے۔''(۱۱)

جوشؔ کے نزدیک عورت کی اس سے زیادہ وقعت نہیں کہ جب چاہیں اسکا استحصال کر کے اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑا جائے اور جب دل کرے اس سے نفس کی آگ بجائی جائے۔ اس کے بعد

وہ یہ بھی مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں جٹا پاتے ہیں کہ ان حرکات کے کیا منفی نتائج برآمد ہوئے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ وہ خودنوشت میں اپنی شہوانی فتوحات اورام دپرستی کا نقارہ جس انداز میں بجاتے ہیں، اس سے ان کی یہ منشا بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی نسلی برتری اور پٹھان خون کی مردانگی باور انا چاہتے ہیں جو پھر سے انسان دوستی کے برخلاف ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔

آئیے اب جوش کی تلون مزاجی وتضاد بیانی کی ایک اور مثال سے روشناس ہوتے ہیں، جس میں وہ خود کے پارسا اور عاشق صادق ہونے کا دم بھرتے ہیں:

> ''میں نے کبھی اپنے دل کو عیاشی کا وطن بننے نہیں دیا......میں نے کسی آوارہ یا بازاری عورت سے کبھی ایک بار بھی عشق نہیں کیا۔'' (۱۲)

اس دعوے سے تو بظاہر لگتا ہے کہ وہ طوائفوں کے ساتھ راہ ورسم رکھنے کو معیوب جانتے ہیں اور اس پیشے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے، لیکن جوش کی بوکھلاہٹ اور تضاد بیانی اس وقت ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم گاندھی جی کے سماج کو شفاف بنانے کی تحریک کا ذکر خودنوشت میں پاتے ہیں۔ جس میں وہ قحبہ گری اور بازار حسن کے مراکز کو بند کیے جانے پر بوکھلاتے ہوئے یوں اپنے من کے چور کو باہر نکالتے ہیں:

> '' (گاندھی جی) انسانی شادمانی کے بدترین دشمن تھے۔ انہوں نے جب بازار حسن اور خرابات مغان کے خلاف غیر عاقلانہ آواز اٹھائی اور انسانی مسرت کا گلا گھونٹ دینے کی مجرمانہ تحریک چلائی......لنگوٹ باندھ باندھ کر لوگ دوڑ پڑے۔'' (۱۳)

اسکے بعد جوش خود کو در پردہ استثنا دیے جانے اور برابری کے حقوق کی صریح پامالی کرتے ہوئے یہاں یہ شگوفہ بھی چھوڑتے ہیں:

> ''بادہ خواری اور حسن پرستاری کا حق پہنچتا ہے صرف ان خاصانِ خدا کو، جو اقطاب و اولیائے ادب ہیں۔'' (۱۴)

لطف کی بات یہ ہے کہ جوش صاحب کو ان چیزوں کی اجازت عام دیے جانے پر بھی اعتراض ہے۔ وہ اس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں سماج میں اس سے خرابیاں نہ پیدا ہوں۔ تضاد بیانی کی اس کشمکش کو انکے اس اقتباس میں ملاحظہ کریں:

''اگر ہرا یرے غیرے، نتھو خیرے کے ہات میں بلوریں جام اور زلف مشک آشام دے دی جائے گی تو، معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور خدانہ خواستہ حکام اس کے خوگر ہو جائیں گے تو پورا ملک تباہی کے کھڈ میں گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔'' (۱۵)

'یادوں کی بارات' کے مطالعے کی روشنی میں ان کی ایک اور تضاد بیانی کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔ وہ ہے، بار بار جوش کے اشرافی کردار اور ترقی پسند نظریات کی تبلیغ وحمایت میں تصادم نظر آنا۔ جوش عمر بھر ترقی پسند اور اشتراکیت کے نظریے سے قولاً دست بردار نہیں ہوئے۔ انکی شاعری کا متعدد بہ حصّہ اس نعرے پر مبنی ہے لیکن عمر کے آخری پڑاؤ پر جب وہ اس خودنوشت کو لکھ رہے تھے تو اپنے اجداد کے شاہانہ جاہ وجلال کے قصّے قلمبند کرتے ہوئے معاً یہ بھول جاتے ہیں کہ جاگیرداری کا تصور نہ صرف اشتراکیت کے برعکس ہے بلکہ شخصی آزادی کے تصور پر بھی کاری ضرب ہے۔ اپنے ماضی کے جاگیردارانہ اور نوابوں والی زندگی کو یاد کرتے ہوئے ایک جگہ اپنی حویلی کے اندرونی اور بیرونی مناظر کا حال ایسے بیان کرتے ہیں:

''لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں مغلانیاں، انائیں دائیاں، کھلانیاں، استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں چاروں طرف دوڑتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ شریف گھرانے کی غریب عورتیں چند اچھے دن گزارنے کے لیے مہمان آتیں اور جب چلی جاتیں تو نئی مہمان عورتیں ان کی جگہ آکر پُر کر لیتی تھیں۔'' (۱۶)

اسی طرح حویلی کا بیرونی منظر یوں بیان کرتے ہیں:

''خدمت گاروں، آبداروں، فراشوں، سپاہیوں، مولیوں، ماسٹروں، مصاحبوں، داستان گویوں، ہمنشیوں، ضلع داروں، کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا۔ اس کے علاوہ شاعروں سے ہمیشہ دو چار مہمان رہتے۔'' (۱۷)

اپنے داد کے ٹھاٹھ باٹھ اور جاہ وجلال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان کی پچیس تیس بیویاں چار نکاحی اور باقی سب لونڈیاں باندیاں تھیں۔ وہ ایک سو بارہ بچوں کے باپ تھے......ان کا انتقال اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا۔ انہوں نے بلوغ کے بعد سے انتقال تک کبھی ایک رات بھی عورت کے بغیر نہیں گزاری......(دادا نے) اپنے کسی فرزند کو میرے چچا یا باپ کا دست نگر نہیں رکھا اور گزارے کے بدلے سب کو دل کھول کر

گاؤں اور باغ مرحمت فرمائے۔ بعض کو کم لیکن کسی ایک فرزند کو بھی محروم نہیں رکھا اور بیٹیوں کو بھی جو لونڈیوں ، باندیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں تھیں کم از کم دو گاؤں اور دو باغ کا مالک بنادیا۔‘‘ (۱۸)

پروفیسر گیان چند اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب طنز کا وار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’گویا پورا اودھ ان کی جاگیر تھا۔‘‘ (۱۹)

جوشؔ کے عمر بھر کے ترقی پسند اور اشتراکیت کے چیختے چنگھاڑتے نعرے دیتے رہنے کے باوجود بھی ان میں جاگیردارانہ روح اس طرح سمائی تھی کہ ساری عمر وہ انکا پیچھا کرتی رہی۔ نئے دور کا لکھنؤ انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اپنے نعروں کے برخلاف وہ لکھنؤ میں اسی جاگیردارانہ تزک و احتشامی طرز کے متلاشی نظر آتے ہیں جس ماحول میں بقول انکے بچپن کی پرداخت ہوئی تھی۔ اپنے جاگیردارانہ اشرافیائی پس منظر میں ڈوبی یاد کی کشمکش کو اس اقتباس میں ظاہر کرتے ہوئے اور لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیبی کشمکش پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

’’اب نہ وہ لکھنؤ ہے اور نہ لکھنؤ والے، ایک ایک کر کے چلے گئے سب خاک کے نیچے۔ نہ وہ شاندار فیشن ہے نہ عمدہ قسم کی بند گھوڑا گاڑیاں نہ اعلیٰ درجے کے تانگے...... چوک میں قدم رکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ کوتاہ اندیش مسلمان اخلاق کے اجاڑے ہوئے چوک نے آنسو بھر کر سلام کیا۔ ہائے وہ چوک جو شبستان، رنگ و بو تھا اب بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ جن کمروں میں پریاں رہتی تھیں اب کالے دیوؤں کو وہاں آباد کر دیا گیا ہے۔ جو فضا سارے گاما کے جھولوں میں جھولا کرتی تھی، اب اس پر ’’اے بائی (اے بھائی) جلندھر سنگھا‘‘ اور ہاپج (حافظ) کھدائی بکس (خدابخش) کے نعروں کو سوار کر دیا گیا ہے۔ ہائے جن چھتوں پر زلفیں لہرایا کرتی تھیں وہاں داڑھے پھٹکارے جارہے ہیں۔ جہاں طبلے گمکتے تھے وہاں خارشیے کتے بھونک رہے ہیں۔ اور جہاں چاندنی رہا کرتی تھی وہاں دھوپ بسادی گئی ہے۔‘‘ (۲۰)

انسان دوستی کے تمام تر دعوؤں اور خود کو مؤید بالانسان کہنے کے باوجود جوشؔ کا ایسا اشرافیائی طرز زندگی کی طرف رجحان، تضاد و کشمکش کا بین ثبوت ہے۔

اس خودنوشت کے مطالعے سے جوشؔ کے مذہبی نظریات سے بھی خوب آگاہی ہوتی ہے اور یہ بھی

پتا چلتا ہے کہ وہ اس حوالے سے کیسی کشمکش میں گرفتار تھے۔ خودنوشت میں ان کے مذہب کی طرف میلان اور اسکے بعد مذہب کے قلادے کو اتار پھینکنے کے منازل کا ذکر تفصیل کے ساتھ مرقوم ملتا ہے۔ وہ کبھی خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی وجودِ خداوندی سے منکر بن جاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ بعض موقعوں پر ہم انہیں اقرار وانکار کے دوکروں کے بیچ میں بیٹھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس پیچیدہ نفسیاتی کیفیت کے پس پشت جن عناصر کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے وہ انانیت، خود پرستی اور جنسی ہیجان وکج روی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس دہریت مزاجی کی اور کوئی فلسفیانہ اور منطقی توجیہ انکے یہاں نہیں ملتی۔ جیسا کہ بعض ملحدوں و مادہ پرست فلسفیوں نے اپنے کفر والحاد کی بنیاد سائنس وفلسفہ پر رکھی ہے۔ جوش جب ذات باری تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو اس وقت ہمیں ان میں حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی کا اظہار ملتا ہے، دوسری اہم بات انکا انکار تراشیدہ خدا(Personified God) کے تصور کے خلاف بیزاری اور بغاوت محسوس ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ایک ممکنہ صورت انکار کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین بلامواخذہ چاہتے ہیں اور ہر جواب دہی سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اوٹ پٹانگ تاویل کرکے خود کو تسلی اور دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں کیونکہ ان کے اور سماجی تقاضوں کے مابین ایک کشمکش وتصادم کی صورت بھی واضح ہے، جسے ایڈلر Social Interest کا نام دیتے ہیں۔ ایڈلر کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی فطرت کے تقاضے اور سماجی اصول کے بیچ ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو ایسے میں متاثرہ شخص میں منفی رجحان زیادہ جنم لیتے ہیں اور اور اسکی شخصیت انتشار کی شکار ہوجاتی ہے جو بعینہ ہم جوش کے یہاں پاتے ہیں۔

خودنوشت میں اکثر جوش مذہب سے متعلق کوئی نہ کوئی بات دانستہ طور یا نادانستہ کرہی جاتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ اپنے رشتہ داروں کا تعارف کراتے ہیں تو معاً مذہب سے متعلق بھی کچھ تبصرہ کرجاتے ہیں۔ اس تکرار ذکر کو نفسیاتی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انکے ذہن وقلب میں مذہب کا کھٹکا اور اثر ضرور ہے۔ وہ اپنے اوائل دور میں مذہب کے تئیں شدید لگاؤ کا ذکر بھی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ حضرت حیدر شاہ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ انہوں نے اپنا حلیہ اور وضع قطع بھی مذہب کے مطابق ڈھالا تھا۔ جنس وتعیش کی زندگی سے بھی کنارہ کش ہوگئے تھے لیکن کچھ عرصے بعد ہی

اور حتی المقدور ضبط نفس کرنے پر بھی وہ جنسی ہیجان کا گلا گھونٹنے میں نا کام ہو گئے۔ ان میں جنسی ہیجان ایسا عود کر کے واپس آیا اور ایسا طوفان اندر برپا ہوا کہ 'انا' نے ذاتِ باری کے مقابل کھڑے ہونے کی جرأت کر ڈالی یا بالفاظ دیگر اپنے نفس کے سامنے گھٹنے بلکہ کہنا چاہیے ماتھا ٹیک دیا۔ مصنف اپنی اس طوفانی شخصیت اور اپنی متلون مزاجی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا...... ایسی نمازیں جن میں لب پر آیتیں ہوں اور دل میں شکایتیں، کس مرض کی دوا ہو سکتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ایک توپ سی چلی۔ میرے دل میں، دھائیں سے میری کھوپڑی میں چٹاخا پیدا ہوا۔ میری عقل، میرے سر سے نکل پڑی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھ کو چونچ دکھانے لگی۔ اور میں نے جھٹ سے نماز توڑ ڈالی۔ حجرۂ نماز سے دیوانہ وار باہر آیا۔ حجام کو فوراً بلا لیا، داڑھی منڈوا دی...... ٹمٹم منگائی...... دن دہاڑے ایک نازنین کے کمرے پر چڑھ گیا اور گانا سُننے لگا...... اور آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر کہا۔
>
> ؎ ''لو بندگی، کہ چھوٹ گئے، بندگی سے ہم''
>
> اور رات کو گیارہ بجے اس نازنین کی گدگدی مسہری پر لیٹا تو وہ کچھ داڑھی کا لبیں ترا شا مُلا جو میرے حجلۂ اول میں آ کر بس گیا تھا اپنا مصلیٰ اور بدھنا بغل میں داب کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے تجھ پر خدا کی مار، اے مردود کہتا ہوا چلا گیا اور اس مُلا کے جاتے ہی میری خواب گاہ میں میرا گم کردہ شاعر...... ہنستا ہوا در آیا۔ اس نے دوڑ کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور گانے لگا۔'' (۲۱)

مذکورہ بالا بیان کے مطابق جوش نے جو مذہب کو چھوڑ کر تعقل پسندی کی زندگی اختیار کی، وہ تعقل کی نہیں تعیش کی زندگی کہی جا سکتی ہے اور خدا پرستی کو چھوڑ کر خود پرستی ہے۔ انہیں جس عقل نے چونچ دکھائی تھی وہ اُن چھپی ہوئی لاشعوری جنسی خواہشوں نے چونچ دکھائی تھی جنہیں ابھی تک وہ دباتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے اندر اس مرحلے میں جو کشمکش دکھائی دیتی ہے وہ زاہد اور رند، مُلا اور شاعر اور لاشعور اور شعور کے متصادم ہونے کی رسا کشی ہے۔ یہاں جو لاشعور کی فتح کا اظہار ان کی طرف سے ملتا ہے، وہ صرف جنسی تسکین ہے جس کے دباؤ سے وہ گزر رہے تھے، ورنہ انکارِ خداوندی کے تصور کی کوئی دوسری معقول اور ٹھوس فلسفیانہ اور منطقی استدلال کی توجیہ کرنے سے وہ عاجز دکھائی دیتے ہیں۔

جوشؔ نے اپنے بنیادی میلانات میں سے انسان دوستی کو بھی اہم مرتبہ دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے لیے اللہ کا انکار بھی قولاً کرنے میں باک نہیں کرتے ہیں بلکہ فخر سے اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

''ہر طرف سے منھ موڑ کر میں کافر باللہ ومومن بالانسان'' (۲۲)

اس تناظر میں اس کفر والحاد کی ایک اور وجہ شخصی خدا کا تصور ہے، جو انکے ناپختہ ذہن کا تراشیدہ تھا۔ دنیا میں لوگوں کے آلام ومصائب اور طاقت کے ناتواں کو کچلنے اور ظلم و بربریت پر خدا کے خاموش رہنے کی جب انہیں کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی تو وہ احتجاجاً انکار کرنے کی گستاخی کر جاتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ مکمل اس عقیدہ پر محکم ہوں، وہ اندرونِ خانہ اقراری بھی ہیں۔ وہ ایک عجیب سی کشمکش اور بھنور میں گھرے نظر آتے ہیں۔ اپنے اس مخمصے کی حالت کے بارے میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''بہر حال میں اقرار وانکار کے دو کروں کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوں، نظامِ سماوی کو دیکھتا ہوں تو کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا، دل اقرار کرنے لگتا ہے اور نظامِ ارضی کو دیکھتا ہوں تو اس میں کروروں خلا نظر آتے ہیں اور حیاتِ انسانی کی عبرتناک بے ثباتی اور اس کی بے کراں درد مندیوں پر نگاہ کرتا ہوں تو دل انکار پر مصر ہو جاتا ہے۔'' (۲۳)

جوشؔ کے خدا کے ایسے تذبذب بھرے تصور پر خورشید علی خان بھی ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ چناچہ وہ اس ضمن میں اپنی کتاب میں انکے بارے میں لکھتے ہیں:

''جوشؔ صاحب کی نظم ونثر میں جہاں جہاں خدا کے خلاف خیالات ملتے ہیں وہ دراصل خدا کے اس تصور کے خلاف ہیں جو ناپختہ ذہن کا تراشیدہ ''شخصی خدا'' Personified God ہے۔'' (۲۴)

'یادوں کی بارات' کے مطالعے سے جوشؔ کی مذہب اور خدا بیزاری اور تصادم کی ایک وجہ انانیت بھی ہے جسے ''وہ تعقل پسندی'' کا نام دیتے ہیں۔ اس تعقل پسندی کا تفاخر آمیز دعویٰ وہ خودنوشت میں بار بار کرتے نظر آتے ہیں لیکن دوسری طرف علم کے ماورائی سرچشمے مثلاً خواب پر بھی عمل پیرا ہو کر دس سال نظامِ دکن کے زیرِ سایہ رہتے ہیں۔ روزِ محشر شافعِ محشر سے اپنے گناہوں کو بھی بخشوانا چاہتے ہیں۔ اہل بیتِ اطہار اور خاص کر پیغمبر اسلام ﷺ، حضرت علیؑ اور حضرتِ حسینؑ کی مداح سرائی بھی کرتے ہیں، باایں

ہم ان میں جب انانیت کی کیفیت غالب آجاتی ہے تو پھر ایسے فقرے بھی منہ سے نکل جاتے ہیں:

''اس دھرتی ماتا پر کون ایسا مائی کا لال اور کون ایسا سورما ہے، اور کس کے منھ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ سینہ ٹھونک کر یہ دعویٰ کر سکے کہ میں آبائی عقائد اور ان عقائد کے پیدا کردہ مزاجی قوام سے، کلیۃً آزاد ہو چکا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ہمہ وجوہ آزاد ہو چکا ہوں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ احساس، خودستائی ہے یا خود فریبی۔ دانش مندی ہے کہ حماقت۔'' (۲۵)

جوشؔ جہاں ایک طرف اپنے سابقہ عقائد پر ایمان رکھنے کو عقل بیزاری سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں بھی ایک زمانے میں عقل بیزار و عقائد پرستار تھا۔ میری دُنیا میں بھی روایت کو درایت پر ترجیح حاصل تھی۔'' (۲۶)

تو وہیں دوسری جانب صرف ایک صفحے کے بعد ہی اپنے دل کے چور اور اندر چل رہی کشمکش کو ظاہر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اظہارِ حقیقت میں شرمانا کیسا، میں تم سے اپنے دل کا یہ چور بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آباء و اجداد مجھ کو پکڑ لیتے ہیں تو میرا جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ انھوں نے جو مافوق الفطرت باتیں مجھ سے کہی تھیں۔ اللہ کرے وہ ساری کی ساری سچ نکلیں۔ مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں، اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملوں۔ شافع محشر سے اپنے گناہ معاف کرا کے جنت میں جاؤں، حوضِ کوثر کے کنارے، جام پر جام لنڈھاؤں، اور حور و غلماں کو بھینچ بھینچ کر گلے لگاؤں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ، یہ بھی سن لیجئے کہ ان کم زور لمحوں کے روزن سے، جب میری عقل، جھانک کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے تو' میرے مرجھائے گالوں پر تڑاق سے تھپڑ مار کر مجھ سے کہتی ہے کہ اے ستر بہتر برس کے بڈھے، بول، تو نابالغ کب تک رہے گا، تیرے دودھ کے دانت کب ٹوٹیں گے؟ اور اے کھوسٹ تیرے دل میں جو بچّہ بیٹھا فیل کر رہا ہے، اسکی مسیں کب تک نہیں بھیگیں گی؟......آج بھی میرے دل میں دنیا کے تمام بانیان مذاہب کا بے حد احترام ہے اور خصوصیت کے ساتھ قوت و حیات کے شہکار حضرت محمد عربیﷺ، حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کا شیدائی اور آبائی عقائد سے آزاد ہو جانے کے باوجود میں ان متذکرہ بالا تینوں ہستیوں کا دل سے پرستار ہوں۔'' (۲۷)

'یادوں کی بارات' خودنوشت میں ترکِ وطن کے واقعہ سے پیدا شدہ نفسیاتی کشمکش بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہے۔ ویسے تو جوشؔ کے بقول شاعر و ادیب کا کوئی محدود وطن نہیں ہوتا۔ اور وہ خود ہر جگہ کو اپنا مسکن مانتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اس دنیا کے ہر قریب دور ملک کو بلا استثنا اپنا وطن اور اس کرۂ ارض کے ہر نیک و بد انسان کو بلا استثنا اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔'' (۲۸)

لیکن انہوں نے دوستوں کی فہمائش پر اور اپنی تہذیبی شناخت کو قائم رکھنے کے لیے، بالخصوص اپنی آئندہ کی نسلوں کی تہذیبی اور لسانی مستقبل کی حفاظت کے لیے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن توقع کے بالکل برعکس جب وہاں کی زمین ان پر تنگ پڑ گئی اور آسمان برہم ہو گیا اور جن آسائش کی طمع لے کے وہ پاکستان آئے تھے ان تمام خوابوں کے محل پے در پے زمین بوس ہونے لگے، کاشت کاری کے لیے زمین، مکان، الاٹ منٹ، باغ لگانے کی زمین، پٹرول پمپ، سینما کے لیے پلاٹ، سنیما کے ساز و سامان کا لائسنس، پریس کا اجازت نامہ، دیہی ترقی کے محکمہ میں نوکری کی عرضی، رستوراں کی تعمیر کا اجازت نامہ وغیرہ کے نتائج بالکل غیر متوقع ثابت ہوئے اور اس طرح لگا تار نامحرومیوں اور حادثات نے انکو گھیرا تو جوشؔ کے بقول انکی حالت ایسی ہو گئی:

''ان مسلسل ناکامیوں نے مجھ کو چکرا دیا، شدتِ یاس اور ہجومِ افلاس نے میرا احاطہ کرلیا۔'' (۲۹)

ہندوستان کی آسائش اور اپنے آباؤ اجداد کے جاہ و حشم کے تصور کا موازنہ جب وہ اپنی حالیہ زندگی سے کرتے ہیں تو نفسیاتی کشمکش کی ایسی تصویر نکل کر سامنے آتی ہے:

''گڈمڑا کر بستر پر لیٹ جاتا اور کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا، لیکن نیند کسی طرح بھی نہ آتی تھی اور تمام بدن میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ گھنٹوں کھر کھر کھجایا کرتا اور چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کے مانند رات بھر تڑپتا رہتا تھا اور صبح کو جب خط بنانے کے واسطے آئینہ کے سامنے بیٹھتا تھا تو اپنا بے خوابی کا روندا ہوا تھتھا کا سا منھ دیکھا نہیں جاتا تھا اور اپنی شکل دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھو بڑ قسم کے مسکین شاہ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے دانت نکال کر بھیک مانگ رہے ہیں۔'' (۳۰)

جوش کی اس حالت کے پس پشت انکی انا اور غیرت کا دخل بھی مانا جاسکتا ہے۔وہ ساری عمر پاکستان میں بیٹھے رہنے کے لیے آمادہ تھے اور عتاب پر صبر کرنے کے لیے تیار تھے لیکن ان کی غیرت کو یہ بات گوارہ نہیں تھی کہ کوئی انہیں پاکستان سے بھاگا ہوا بھگوڑا کہے یا انکے پٹھان خون کی خودداری پر شک کرے۔یہی وجہ ہے کہ اس خودنوشت میں جوش ہمیں ماضی پرستی کو زیست کا سہارا بناتے ہوئے ملتے ہیں اور رومانی وادیوں میں خیمہ زن نظر آتے ہیں۔یہ ماضی پرستی دراصل اس ناآسودہ صورت حال سے بچنے اور بے فکر ہونے کے لیے ایک فرار کی راہ ہے، جس سے وہ اپنے آپ کو وقتی طور سنبھال لیتے تھے۔خود نوشت میں ایک جگہ اس اضطراری کیفیت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

''میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں، غیرت نے اجازت نہیں دی میں نے دل سے پوچھا خاں صاحب اب کیا ہوگا، دل نے کہا ہمت نہ ہار، اگر خار سے بود، گل دستہ گردد۔''
(۳۱)

جوش ''یادوں کی بارات'' میں اپنی مردانہ وجاہت، قادر الکلامی، حسب ونسب اور اشرافیت کا ذکر جابجا کرتے ہیں۔وہ خود پسندی میں اس انتہا کو پہنچے تھے کہ انہیں اپنی ذہانت اور خوبصورتی پر بھی بے انتہا فخر تھا۔انکے سارے معاشقے بھی کامیاب ہی رہے تھے اسی وجہ سے انکی شاعری نشاطیہ پہلو سے زیادہ ا یز نظر آتی ہے۔میر ویاس والا عشق انکا نہ تھا، نہ انہوں نے ویسی زندگی بسر کی تھی۔ہجر کی صعوبتیں جھیلنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔وہ بسمل ہونا نہیں، کرنا جانتے تھے۔وہ نازِ معشوقانہ اٹھانے والے نہیں تھے بلکہ اٹھوانے والے لوگوں میں سے تھے۔متذکرہ بالا خوبیوں اور خصوصیات نے ان میں نرگسیت اور خود پرستی کے عناصر کو جنم دیا۔یہی سبب ہے کہ خودنوشت میں انکی خوبیوں کا برملا اظہار تکرار کے ساتھ ملتا ہے، کیونکہ نرگسیت اور خود پرستی میں ڈوبے شخص کی ذات اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ وہ اپنی نمود ونمائش چاہے، وہ اسیر ہونے کے بجائے اوروں کو اسیر بنائے اور اپنے مدمقابل یا بالاتر سے حسد اور خطرہ محسوس کرے اور حتی الامکان کوشش کرے کہ مخالف قوت مغلوب ہو۔ہم بعینہ یہی رویہ جوش میں بھی پاتے ہیں۔اپنے والد سے حد درجہ نفرت اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے مقابل کھڑے ہونا اسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔اسے ہم فرائڈ کے بتائے ہوئے یوڈیپس گرہ کے تناظر میں بھی سمجھ سکتے ہیں جہاں بیٹا باپ کی اقتداری (God

Father) حیثیت سے خلاصی چاہتا ہے۔ اس گرہ کی منفی صورت میں جو رویّے جنم لیتے ہیں وہ بغاوت، انکار، طنز و استہزا ہیں۔ چنانچہ ہم اسکی بھی متعدد نظیریں خودنوشت میں پاتے ہیں، چند ایک کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ فرائڈ کے بتائے اس گرہ کی روشنی میں ہم جوش کی مذہب بیزاری و بے نیازی کا سبب بھی جان سکتے ہیں۔ فرائڈ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ باپ ہی کا تصور تھا جو آدمی کو خدا جیسی انجانی ہستی کے تصور تک لے گیا۔'' (۳۲)

بہرالحال! جوش کی نرگسیت میں مبتلا ہونے کا اندازہ انکے اس قول سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

''میں آئینے کے سامنے جا کر اپنا منہ دیکھنے لگا۔ گالوں پر سرخی کے ہلورے، آنکھوں میں گلابی ڈورے، چھریرا بدن، پتلی کمر، گھنیرے بال، پتلے پتلے ہونٹ، لانبی لانبی پلکیں......
اُف میں کس قدر حسین ہوں، زندگی میں پہلی بار اس کا پتہ چلا۔ اللہ بھلا کرے طلوع صبح کی رنگینی کا جس نے میرا پوشیدہ جمال مجھ پر آشکار کر دیا۔ وہ جمال جو آگے چل کر زمین پر پاؤں نہ رکھنے والے مغرور حسینوں کے سروں کو، اپنے قدموں پر جھکا لینے والا تھا۔'' (۳۳)

ایک اور جگہ اپنی انانیت و نرگسیت کا اعتراف کرتے ہوئے خامہ فرسائی کرتے ہیں:

''جہاں تک محبوبوں کا دل موہ لینے کا تعلق ہے میرا ایک بھی معاشقہ ناکام نہیں رہا اور بات صرف یہیں تک نہیں رہی بلکہ یہاں تک بھی ہوا کہ حسین عورتوں نے خود مجھ سے عشق کیا اور بعض نے تو یہاں تک مجھ کو چاہا کہ مجھ میں نازِ معشوقانہ پیدا کر دیا۔'' (۳۴)

جوش نے عمر کی آخری منزل میں اس خودنوشت کو رقم کیا ہے۔ اس خودنوشت کے محرکات میں ایک بڑا نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نرگسیت زدہ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ وہ کبھی بھی فراموش کیے جائیں۔ وہ خود کے عاشق تھے اور لوگوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی انہیں بھرپور چاہیں یا یاد رکھیں۔ عام لوگوں سا حشر انکے ساتھ نہ ہو، اس مقصد کی خاطر انہوں نے ارادۃً کچھ ایسے شگوفے بھی 'یادوں کی بارات' میں چھوڑے ہیں جن کی قلعی اگرچہ ماہر القادری، عبدالماجد دریا آبادی، پروفیسر گیان چند جین وغیرہ نے کھولی ہے لیکن وہ چاہتے تھے کہ ان کے بعد بھی موشگافیوں کے کواڑ کھلے رہیں اور لوگ ان کا نام لیتے رہیں۔

مختصر یہ کہ ''یادوں کی بارات'' ایک ایسی متضاد خودنوشت ہے جو جوش کی مختلف نفسیاتی کشمکشوں

کی طرف راہ نمائی کرتی ہے، ساتھ ہی یہ اپنے عہد کی نفسیاتی کشمکش سے بھی روشناس کرا کے اس کی گرہیں کھولنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بہر کیف! ان کے حق میں اور خلاف جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انکی عظمت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

’’بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل‘‘(۱۹۷۲ء)شورش کاشمیری

’’بوئے گل ،نالہ دل دود چراغ محفل‘‘ آغا شورش کاشمیری کی زیست پرمبنی ایسی خودنوشت ہے جس میں موصوف اوران کے عہد کی نفسیاتی کشمکش کی ایک دنیا ٔ جزن ہے۔ یہ صرف ایک فرد کی نہیں بلکہ اُس معاشرے اور پورے عہد کی تاریخ ہے جسکے آئینے میں سب یکجا جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ آغا شورش ایک ایسی عہد پرور اور عہد آفرین شخصیت تھی جس کی نظیر زمانے میں بمشکل ملا کرتی ہے۔ وہ بیک وقت مشہور و معروف شاعر، دوراندیش سیاست دان، شعلہ نوا خطیب اور دلیر صحافی تھے۔وہ ان سب میدانوں میں شہسوار بھی تھے اور شورش بھی پیدا کرنے والے تھے۔

’’بوئے گل ،نالہ دل دود چراغ محفل‘‘ ۱۹۷۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی شورش صاحب کی زندگی کے اہم واقعات، انکے سیاسی، مذہبی، قیدو بند کی صعوبتوں اورافکار کی ترجمان ہے۔اس خود نوشت کے نام کو مصنف نے غالبؔ کے ایک مصرعے سے معنون کیا ہے۔انکا خیال ہے کہ انکی پوری زندگی کا خلاصہ اس مصرعہ میں چھپا ہوا ہے۔وہ خود ایک جگہ اس مصرعے میں سمٹی اپنی زندگی کی مختصر الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’بوئے گل:۔میرا بچپن تھا، آہوئے رمیدہ کی طرح اڑنچھو ہو گیا۔
>
> نالۂ دل:۔میری جوانی تھی جو زندگی کے ترکش سے تیر کی طرح نکل گئی۔
>
> دودِ چراغِ محفل:۔ ان سانحات وحادثات کا نچوڑ ہے جنہیں مرحوم جوانی کے دوش پر اُٹھائے پھرتا ہوں غرض اپنی طویل تلخیوں کی نقشِ خونچکاں میں نے اپنے الفاظ میں کفنا دی۔‘‘ (۳۵)

غالبؔ کا مذکورہ مصرعہ نفسیاتی کشمکش کی تصویر تو پیش کرتا ہی ہے لیکن اس کے آئینے میں خودنوشت نگار کا خود کو دیکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ موصوف کی زندگی بھی کشمکش کا گہوارہ ہے۔اس خودنوشت کو تصنیف کرنے کے پس پشت جو محرکات ہیں وہ تو گہری نفسیاتی کشمکش اور محرومی کو ظاہر کرتے ہی ہیں لیکن تصنیفی عمل بھی شورش صاحب کی سخت قسم کی الجھن کو آشکار کرتا ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ کشمکش بخوبی ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

''کئی سال صرف اس کشمکش میں نکل گئے کہ اسلوب کیا ہو؟ کئی اسلوب ذہن میں آتے اور چلے جاتے رہے کسی اسلوب پر دل مطمئن نہ ہوسکا۔ باور کیجیے کہ کئی مسودے لکھے اور لکھ کر پھاڑ ڈالے ایک دفعہ ساری کتاب مکمل کر لی لیکن اس لیے سارا مسودہ تلف کر دیا کہ مطمئن نہ تھا۔''(۳۶)

آغا صاحب کی اس متذبذب اور عدم اطمینانی حالت کے پس پردہ کئی عوامل کارفرما ہوسکتے ہیں جن کی بابت آگے تفصیل سے کلام ہوگا لیکن یہاں جو خاص اثرات غالب نظر آتے ہیں وہ تکمیلیت پسندی کے ساتھ ساتھ احساس برتری کا جذبہ ہے۔ ایک تکمیلیت پسند ادیب اور انسان کو یہ ڈر ہمیشہ ستاتا رہتا ہے کہ اس سے کچھ ایسا نہ صادر ہو جائے جو اسکے معیار اور مرتبے کے منافی ہو۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ مصنف کی خطابت اور انشاپردازی کا اُس وقت ہر طرف شہرہ تھا لہذا اسکی مستقل محافظت کی خاطر وہ مسودے لکھتے تھے اور لکھ کر پھر کاٹ دیتے تھے اور بار بار اس عمل سے گزرتے تھے۔ ماحولہ اقتباس سے اب اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر اسلوب کی بنا پر اس طرح کے تشویشات اور تحفظات ہیں تو واقعات کو بیان کرنے میں مصنف کو کس طرح کی الجھنوں کا سامنا رہا ہوگا اور جملہ زندگی نفسیاتی کشمکش کی کیسی تصویر رہی ہوگی! اب خودنوشت میں شامل اس اقتباس کی تصویر میں انکی کشمکش کو دیکھنے کی کوشش کیجیے:

''(میں نے) انہی واقعات کو چھیڑا ہے جو میرے حافظہ میں رہ گئے ہیں یا میری ذات سے متعلق ہیں، یا جن کی سیل میں سے گزر چکا ہوں، بعض چیزوں کی تفصیل عمداً ترک کر دی ہے۔ ایک تو ان کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں، دوسرے ان کا خاک نسیان میں دفن ہو جانا ہی بہتر ہے، بعض سنگین پہلو سیاسی بدمزگی کے باعث ترک کر دیئے ہیں، بعض عقیدتوں کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچانے سے عمداً احتراز کیا ہے۔ کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں بالارادہ چھوڑ دیا ہے، مٹی اڑانے سے فائدہ؟''(۳۷)

بہرطور! ہم غالبؔ کے کشمکش واضطراب سے پُر مصرعہ اور اس خودنوشت کے نام کی روشنی میں آغا شورش کی زندگی کی مماثلت ومطابقت تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں اور جائزہ لیتے ہیں کہ ان کی زندگی نفسیاتی کشمکش کا کیسا رنگ ظاہر کرتی ہے اور یہ کہ انکی شخصیت اور ادب پر اسکے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آغاز میں شورش کاشمیری کے دور طفولیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آغا صاحب نے خودنوشت

کے عنوان کے تحت اپنی زندگی کو جن تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے،اس میں ابتدائی حصّہ کو وہ ''بوئے گل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔لیکن یہ بات بڑی عجیب ہے کہ پوری خودنوشت کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انکے بچپن میں کوئی ایسی خاص رنگینی،زیبائی اور رعنائی نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر وہ اپنے بچپن والے حصّے کو''بوئے گل'' سے تشبیہہ دیتے!الہذا مصنف کی ایسی تشبیہ کی کوئی معقول وجہ اس بات کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی کہ بچوں کو پھولوں کا نام دیا جاتا ہے۔اب یہاں اس رعایت سے مصنف کو پھر مُرجھایا ہوایا ایسا ہوا پھول ہی کہہ سکتے ہیں جس کی خوشبو دھوپ کی تمازت اور ہوا کی تندی نے لوٹ لی ہو اور وہ سوکھا پھول کانٹوں کے بیچ رحم وکرم میں سسکیاں لے رہا ہو۔اس ضمن میں خودنوشت سے کچھ حوالے بھی دیے جاسکتے ہیں،جیسے آغا صاحب ابھی ہوش ہی سنبھال رہے تھے کہ انکی والدہ انتقال کر گئیں۔وہ خود اپنے بچپن کے حادثات وصدمات کا ذکر اپنی خودنوشت میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''والدہ واصل بحق ہوئیں تو میں سات یا آٹھ برس کا تھا۔''(۳۸)

والد نے دوسری شادی کی لیکن:

''یہ شادی دو چار برس ہی میں ٹوٹ گئی،اس حادثہ کے بعد ہم تنہا رہ گئے۔''(۳۹)

دادا کی

''ساری کمائی سفینۂ غزل اور صراحی مئے ناب کی نظر ہوگئی۔''(۴۰)

والد ٹین کے کارخانے میں معمولی اجرت پے کام کرر ہے تھے اور گھر کا منظر کچھ ایسی تصویر پیش کرر ہا تھا:

''دو برس سے بے پناہ افلاس،ایک کلبۂ احزان،جس میں بمشکل تین چار چار پائیاں سما سکتی تھیں۔تین چوڑائی اور ایک لمبائی کی طرف بڑی چار پائی کو اینٹوں اور مٹی کے پائے دے کر بالا کیا تھا۔اس کے نیچے ایک اور چار پائی تھی جس پر دونوں بہنیں سوتی تھیں۔میں اوپر کی چار پائی پر سوتا،یہی میز،یہی کُرسی،اسی پر لکھنا،یہیں پڑھنا،بےبسی کی انتہا تھی،بےکسی کا عنفوان شباب۔''(۴۱)

اب ایسی جانکاہ پریشانی میں جو شخص ان کے لیے مسیحا کی مثل تھا وہ انکی دادی اماں تھیں لیکن کچھ ہی عرصے بعد اسی افلاس میں دادی اماں کا انتقال بھی ہو گیا۔انہیں اپنی دادی سے بے پناہ محبت تھی۔آغا صاحب کے لیے اُن کی موت کسی سانحہ عظیم سے کم نہ تھی۔نمونے کے طور پر ان چند سطور میں مصنف کی دادی اماں سے

گہرے لگاؤ اور موت سے ہوئی، جدائی کے صدمے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے کہ افلاس و تہی دستی جیسے حالات نے بچپن میں انہیں کس قدر محزون و پر ملال رکھا تھا:

''دادی اماں کا جنازہ، اتھاہ محبت کی لاش، عمیق شفقت کی میت، کہ اس سے پہلے، میں نے کبھی اتنا پر عظمت جنازہ نہیں اٹھایا تھا...... میں برسوں ان کی قبر پر جاتا رہا، مٹی کے اس ڈھیر کو پہروں تکتا، گھنٹوں سوچتا کیا میں بھی اپنی دادو کی قبر کو پختہ بنا سکتا اور اس پر کتبہ لگا سکتا ہوں؟ پھر ایک طویل آہ بھر کر چپ ہو رہتا، اپنی تہی دامنی پر لہو کے گھونٹ پی کر لوٹ آتا۔ یہ وہ دن تھے جب اُجڑا اُجڑا گھر فاقوں کے دن گزار رہا تھا اور وہ بڑے ہی کڑے دن تھے۔''(۴۲)

شورش کاشمیری خود نوشت میں اپنے بچپن کی تعلیمی کشمکش سے بھی پردہ اُٹھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انہیں عسرت کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، محض میٹرک پر ہی اکتفا کرنا پڑا حالانکہ انھیں پڑھنے لکھنے کا نہایت شوق تھا۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''میں ان دنوں میٹرک کر رہا تھا، چونکہ مزید تعلیم کی استطاعت سے محروم تھا، اس لیے اپنے مستقبل کی ویرانی کے خوف سے پریشان (تھا)۔''(۴۳)

آغا صاحب خود نوشت میں مزید لکھتے ہیں کہ وہ بچپن میں کافی ہونہار طالب علم تھے۔ غلط صحبت اور عادات سے محفوظ رہے تھے، طبیعتاً شرمیلے واقع ہوئے تھے اور اس میں خاص رول اسکول کے پاک ماحول کا بھی تھا۔ وہ اپنی ابتدائی تعلیمی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں ایک محنتی لڑکا تھا، ہمیشہ اچھے نمبروں میں پاس ہوتا، استاد مجھے شفقت کی نگاہ سے دیکھتے، چوتھی جماعت ہی میں مجھے 'زمیندار' (اخبار) پڑھنے کا چسکا پڑ گیا...... میری عادتوں پر اسکول کی اخلاقی فضا نے خوشگوار اثر ڈالا، ہر عیب سے بچا رہا، آج تک ہر نشہ سے محفوظ ہوں...... میری کم آمیزی کہہ لیجیے یا اسکول کی ذہنی فضا کہ اس ابتدائی منزل میں دل و دماغ برائی کے ہر تصور سے خالی رہے، واقعہ یہ ہے کہ دسویں تک مجھے گناہ اور اس کی بوقلمونیوں کا اندازہ ہی نہ تھا، میرا وجود ان کے تصور سے خالی تھا۔''(۴۴)

ان کے اس تعلیمی شوق میں مزید شعور اور نکھار اخبار بینی نے پیدا کیا، چنانچہ شورش صاحب اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ''زمیندار'' اخبار کو اہم محرک مانتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''نویں اور دسویں جماعت میں زمیندار بلا ناغہ پڑھتا۔اس نے مجھے اتنا فائدہ پہنچایا کہ بیان نہیں ہو سکتا......حقیقت یہ ہے کہ زمیندار کے مطالعے نے مجھے اپنی عمر سے آگے کر دیا۔''(۴۵)

زمیندار کے لگا تار مطالعے سے شورش کا سیاسی شعور بچپن سے ہی بالیدہ ہو گیا تھا۔وہ چھوٹی عمر سے ہی ملک میں پوری سیاسی اتھل پتھل اور ریشہ دوانیوں سے بہت حد تک روشناس ہو گئے تھے۔مصنف جب چھٹی جماعت میں ہی تھے تو سائمن کمیشن ہندوستان آیا ہوا تھا۔اس کے خلاف جو عوام کا ردعمل تھا اس واقعہ نے ان کو متاثر کر کے انکی زندگی میں سیاست کی نیو رکھ دی۔دوسری طرف گھر کا ماحول بھی قدرے سیاسی ہو گیا تھا جس کے پیچھے بھی زمیندار اخبار کا ہاتھ تھا پھر یہ کہ مولانا ظفر اللہ خاں سے گھر والوں کا ذاتی نوعیت کا تعلق تھا۔ان کی سیاسی طبیعت کے پیچھے زمانے کی بوقلمونی بھی کارفرما تھی۔وہ بچپن کے زمانے کی ہنگامہ آرائیوں کا ایک جگہ تذکرہ کرتے ہوئے یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

''طبیعت کا رخ شروع ہی سے سیاسی ہو گیا تھا۔میرا یوم پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء ہے۔پہلی جنگ عظیم کا دور،اسی زمانہ میں جنگ کے آثار و نتائج سے معاشرہ کا پہلا سانچہ ٹوٹا اور دوسرا بنا،جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوا۔پنجاب میں مارشل لا لگا،تحریکِ خلافت کا دریا چڑھا اور ایک طوفان اُمڈ آیا،قومی تحریک نے راہ پائی،ملک بھر میں عدم تعاون کے ہنگامے برپا ہوئے،لیڈر شپ کا انداز بدلا،پرانے سیاسی چہرے جھڑ گئے،......سارا ملک کروٹ لے چکا تھا۔ہمارا گھر بھی اس سے متاثر ہوا۔میں آواز آشنا ہوا تو یہ چیزیں میرے ذہنی آب و گل میں تھیں۔گویا دماغ بعض خفی وجلی سیاسی اثرات سے تیار ہو رہا تھا۔غرض یہ زمانہ ہی سیاسیات کا تھا،آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میرا شعور نا پختگی کے باوجود سیاسی ہو چکا تھا۔''
(۴۶)

آغا شورش نے اُس دور میں آنکھیں کھولیں جس میں ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔انگریز ظلم و بربریت کی نئی نئی داستانیں رقم کر رہے تھے۔فتنہ وفساد کو ہر طرف سے ہوا دی جا رہی تھی۔ان سب اسباب کا انکی حساس طبیعت پر اثر پڑنا لازمی عمل تھا،چنانچہ ایسا ہی ہوا،انکے دل و دماغ میں اپنے گرد و نواح میں ہو رہی ناانصافیوں اور ظلم و جور کی وجہ سے کافی گہرا اور منفی اثر پڑا۔ان کے دل میں انتقام کا لاوا اُبلنا شروع ہوا اور آنکھوں میں نفرت کا طوفان رقص کرنے لگا۔اس نفرت کی آگ میں روز بہ روز

اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ ایک دن اس کے شعلے اس واقعہ سے نہایت بلند ہوئے جب انکے والد کو انگریزوں نے بے گناہ پکڑ کے سخت عتاب کا شکار بنایا۔ اس بات سے انکے اعصاب پر جو اثرات پڑے اور مستقبل کی شورش مزاجی کی جو نیو انکے اندر پڑی وہ ان کے اس اقتباس سے بخوبی دیکھی جا سکتی ہے:

''ابّا سے پولیس کی بے تحاشا مار پیٹ کا قصّہ سُنا، ان کے پنڈے پر زخم دیکھے تو جی نڈھال ہو گیا، دادی امّاں اپنے بیٹے کی ضربیں دیکھ کر رات بھر بد دعائیں دیتی رہیں، اس حادثے نے میرے ذہن کو ہلا دیا، میں نے ننھے منّے دل میں عہد کیا کہ بڑا ہو کر انگریزی حکومت کے خلاف اس وقت تک لڑوں گا جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتی ہے۔'' (۴۷)

غرض آغا شورش کے دل میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت جنم لیتی رہی، دوسری طرف بچپن میں فسادات کے بُرے اثرات نے ان کے دل و دماغ کو شدید متاثر کیا۔ اسی بیچ ''زمیندار'' انکا سیاسی شعور سان پے چڑھانے لگا۔ یہ وہی دور تھا جس میں یہ بال بھارت سبھا انجمن سے وابستہ بھی ہوئے۔ ان تبدیلیوں نے آزادی کے جذبے کے حق میں اور انگریزوں کی نفرت میں نعرے لگوائے۔ نتیجتاً اس پاداش میں نشاندہی ہونے پر انکے والد کو تھانے طلب کیا گیا، وہاں سخت ذلیل اور تشدد کر کے واپس چھوڑا گیا اور بیٹے کو سمجھانے کی سخت تنبیہ ساتھ کر دی گئی۔ والد صاحب جب گھر واپس آئے تو خوب پٹائی ہوئی اور ساتھ میں بہت کچھ سننے کو ملا۔ یہ سیاست سے وابستگی پر انکی پہلی تعزیر تھی اور مستقبل کے حوالے سے مصائب اور کشمکش کے موجوں کا پہلا تھپیڑا، جس نے آگے چل کر پھر کبھی دم نہ لیا نہ انہیں لیپے دیا۔ آغا صاحب ان مندجہ بالا اشارات کی روداد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''میرے والد نے مجھے کبھی نہیں پیٹا تھا بلکہ کبھی سخت سست الفاظ بھی نہیں کہے تھے، لیکن اُس دن وہ مجبور ہو گئے تھے، ایک تو اچھے دنوں کی گمشدگی کا انہیں شدید احساس تھا اور وہ عسرت کے جان گسل ایّام گزار رہے تھے، دوسرے جس بات کا انہیں صدمہ پہنچا وہ تھانے دار کی گالیاں تھیں۔ ابّا لہو کے گھونٹ پی کر چلے آئے تھے۔ گھر میں بوڑھی دادی تھیں جن کی نحیف آواز میں ان وفاداروں کے لیے بد دُعا کے سوا کچھ نہ تھا۔ دادا جان مشتِ استخواں رہ گئے تھے، میں نے اپنے والد کو بڑی سے بڑی ابتلاء میں بھی روتے نہیں دیکھا تھا، وہ بڑے دل گردے کے انسان تھے لیکن مجھے پیٹنے کے بعد ان کا جی لرز گیا، وہ آشکبار ہو گئے، دیر تک تخلیہ میں لحاف لے کر روتے رہے، انہیں اپنی عُسرت کا انتہائی صدمہ تھا۔ وہ محسوس کرتے

تھے کہ یہ سب کچھ ان کی غریبی کے باعث ہوا ہے۔''(۴۸)

خلاصہ بحث یہ کہ بچپن کی زندگی جسے شورش صاحب ''بوئے گل'' سے تعبیر کرتے ہیں ایسے گل کی طرح ہے جس کی خوشبو چُرالی گئی ہو۔اس ''بو'' کی محرومی کا احساس انہیں تاعمر رہا، یہ ''بو'' جوانی میں بھی نالۂ دل کی صورت میں نکلتی رہی۔غرض ان کی ابتدائی عمر کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے، کہ وہ شدید قسم کی احساس محرومی اور کشمکش کے شکار تھے پھر چاہے وہ والدین کی محبت کی کمی کا احساس ہو،عسرت وافلاس کا غم ہو یا زمانے کی ستم گری ہو، یہاں یہ خیال رہے کہ وہ زمانہ سخت لایقینی صورت حال، مایوسی ونا کامی سے پُر تھا۔ان سب باتوں نے انکی حساس طبیعت پر گہرا اثر ڈالا۔چنانچہ یہ ایسے اسباب ہیں جو کسی بھی حساس فرد کو متاثر کر کے باغی پن اور سخت مزاجی کی دہلیز کی طرف دھکیل دینے کے لیے کافی ہیں،بعینہ یہی صورت حال شورش کاشمیری کے ساتھ بھی پیش آئی۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خودنوشت اپنے زمانے کے اجتماعی لاشعور کا پتا مصنف کو مرکزی حیثیت ٹھہرا کر دیتی ہے،خودنوشت میں بچپن کی زندگی کے حوالے سے جن اُمور کی تکرار ملتی ہے،مثلاً افلاس اور محرومی محبت یہ انکی نفسیاتی گرہیں اور شخصیت کی تعمیر وتخریب کے وجوہ کی نشاندہی میں مُمد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

اب شورش کی دورِ جوانی پر نظر ڈالتے ہیں جسے وہ ''نالۂ دل'' سے تشبیہ دیتے ہیں،تو واقعتاً یہ دور بھی سخت قسم کی دشواریوں اور چیلنجوں سے بھرا ہوا تھا۔خودنوشت کے مطالعے سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ انہیں جوانی بھر مسلسل مصائب کا سامنا کرنا پڑا،جس کا اظہار نالوں کی صورت میں انکی سوانح میں ملتا ہے۔ ان نالوں میں کچھ نالے بچپن کے ہوا ہو جانے کے حزن وملال پر مبنی ہے کیونکہ یہ وہ دور ہوتا ہے جب دنیا داری کا غم نہیں ہوتا ہے، کچھ نالے جوانی میں محبوب کی محبت اور موت سے متعلق ہیں۔کچھ دیگر عزیز اقارب کی جدائی کے باعث نکلے ہیں، چند قید بند کی دورصعوبت سے وابستہ ہیں،بعض مفید صحبتیں چھن جانے کے رنج کی وجہ سے ہیں،کئی نالے ناموس رسالت پر حملوں کی وجہ سے نکلے ہیں،بہت سے نالے فسادات اور تقسیم کی رنج کے سبب خارج ہوئے ہیں،متعدد نالے عقیدتوں کے بُت ٹوٹنے کی وجہ سے نکلے ہیں اوران میں چند ایسے بھی نالے ہیں جو زمانے کی ناقدری کے بنا پے خارج ہوئے ہیں۔

آغا شورش کا عنفوان شباب تھا کہ وہ تحریکِ شہید گنج کا حصّہ بنے۔ مولانا ظفر علی خان سے عقیدت کے بسبب اتحادِ ملت میں بھی شریک ہوئے۔ اُن کی صحبت نے انکے شعور کو جلا بخشی۔ جس سے آدابِ صحافت سے آگاہی ہوئی۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل کی ذات سے بھی استفادہ کا شرف ملا۔ ہندوستان کے قد آور سیاسی اکابرین کو نزدیک سے دیکھنے اور ان سے کسبِ فیض کرنے کا موقع ملا۔ ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ معاشی حالت قدرے بہتر ہونے لگی۔ انتخابات کا نظارہ کیا۔ ہندو مسلم فسادات کے عینی شاہد رہے۔ بلاتفریق لوگوں کی زندگیاں بچائیں۔ مارکسزم نے ابتدائی جوانی میں ایمان کو متزلزل کیا اور دہریت کی طرف دعوت کفر دی، لیکن جلد چند اسلامی مفکرین کی کاوشوں سے اسلام کی طرف واپس آئے۔ یہ ایسے اشارات ہیں جن کی تفصیل مصنف کی جوانی کی روداد ہے، جنہیں ''نالۂ دل'' جیسی معنی خیز ترکیب سے موسوم اور تعبیر کیا گیا ہے۔

شورش کاشمیری کی عالمانہ ومحققانہ خوبیوں کے پس پردہ انکی تعلیمی کشمکش اور حصول علم کے ذرائع کی داستان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ انہوں نے صرف میٹرک تک پڑھا اور آگے کالج جانے کا بھی نہایت شوق اور ارادہ تھا لیکن قدرت کو انکی تعلیم پرورش کالج کے بجائے زنداں کی سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے کرانی مقصود تھی۔ اپنی غربت کو کالج جانے کے شوق اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں رکاوٹ بتاتے ہوئے وہ اپنی اس کشمکش کو قارئین پر ان الفاظوں کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں:

> ''میں اُن دنوں میٹرک کر رہا تھا۔ چونکہ مزید تعلیم کی استطاعت سے محروم تھا۔ اس لیے اپنے مستقبل کی ویرانی کے خوف سے پریشان تھا۔''(۴۹)

ایک اور جگہ اسکی مزید تفصیل فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بہت سے دفتروں کی خاک چھانی، طبیعت کا میلان مدرّسی کی طرف تھا لیکن اپنی تعلیم ہی کیا تھی؟ کبھی کبھار ابتدائی جماعت کے بچّوں کی ٹیوشن مل جاتی لیکن ان کے والدین ماہانہ دو روپے بھی نہیں دے سکتے تھے۔ قسطوں میں ادا کرتے، کبھی آٹھ آنے کبھی چار آنے اور کبھی روپیہ! خود بے پناہ شوق تھا کہ پڑھوں لیکن کہاں؟ اکثر ہم جماعت کالجوں میں داخل ہو گئے تھے اور اب کالجیٹ ہونے کے غرور میں تھے۔ ان پر حسرت کی نظریں ڈالتا۔ ہوٹلوں کے چکر کاٹتا۔ ان کی کتابیں دیکھتا اور نٹیل کالج کی ماہانہ فیس تب دو روپے تھی، چاہا ''منشی فاضل''

میں داخل ہو جاؤں لیکن اس سے بھی محروم رہا۔ دادی اماں زندہ تھیں تو ''زمیندار'' خرید کے پڑھتا اور یہ معمول ہو گیا تھا وہ بلا ناغہ کھانے پینے کے لیے دو آنے دیتیں، میں ایک آنہ میں ''زمیندار'' خریدتا اور ایک آنہ میں صبح کا ناشتہ کرتا، اب دو آنے ایک طرف رہے دو پیسے بھی نہیں تھے، ایک جوڑا تھا جسے مدتوں خود ہی دھوتا اور پہنتا رہا۔''(۵۰)

مروجہ طریقے کے برعکس آغا صاحب کی تحصیل علم کی تشنہ لبی زنداں کے کنویں سے پوری ہوتی رہی، پھر یہ کہ قدرت نے کمال کا حافظہ بخشا تھا اور سیکھنے سمجھنے کی خداداد صلاحیات ودیعت میں ملی تھیں، اس پر لطف یہ کہ قید خانے میں اہل علم کی ہمہ وقت موجودگی اور رہنمائی نے انکے سارے گلے شکوے اس حوالے سے دور کر دیئے، یوں قید کی زندگی انکے تعلیمی سفر کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ اس حقیقت اور نعمت سے معترف ہو کر وہ ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''۱۹۴۷ء تک میری زندگی کا ہر تیسرا دن جیل خانے میں گزرا، تلخیوں نے مجھے مکمل کیا، سب سے بڑی بات جو میں نے حاصل کی دوستوں کا حلقہ اور کتابوں کی محبت تھی، مجھے اپنی تعلیم کے ادھورا رہ جانے کا بہت افسوس تھا لیکن جیل خانے کے شب و روز نے مجھے علم و فکر میں ڈبو دیا اور میں ان لوگوں سے بہت آگے نکل گیا جو دو دو ڈگریوں کا بوجھ اُٹھائے پھر رہے تھے...... آخری سات برس قید کے ابتدائی ساڑھے تین سال مصیبتوں میں گزرے لیکن میری زندگی کے سنوارنے میں اس قید کا بڑا حصّہ ہے۔ لاہور میں جتنے برس گزرے ان کے شب و روز عظیم تھے، بہترین لوگوں کا ساتھ رہا، ان میں عالم، دانشور، سیاست دان، مدبر، مصنف، معلم، تاریخ ساز اور تاریخ دان سبھی قسم کے لوگ تھے، مجھے نہ صرف ملک کی پچاس سالہ تاریخ سے آگاہی ہوئی بلکہ اس کے احوال و آثار اور نتائج و مظاہر سے کاملاً واقف ہو گیا، کوئی پہلو ایسا نہ رہا جو پوشیدہ رہا ہو اور کوئی سیاسی راز نہ تھا جو ہمراہیوں کے سینہ میں ہو اور میرے علم میں نہ آیا ہو۔''(۵۱)

لیکن اس طویل اور مسلسل اسیری کے چند منفی اور ہولناک نتائج بھی سامنے آئے، ان کا دل جہاں ایک طرف زنجیر الفت میں جکڑا ہوا تھا اور وجود پابند سلاسل تھا وہیں دوسری جانب شورش صاحب کی محبت ان کے انتظار میں قید زندگی سے آزاد ہو گئی اور وہ جدائی کا غم برداشت نہ کر سکی۔

آغا صاحب جن جسمانی اور ذہنی اذیتوں میں مبتلائے عذاب قیامِ قید میں رہے اسکی تفصیلی روداد

کے لیے انہوں نے اگر چہ بہت کچھ تحریر کیا ہے لیکن پھر بھی انکے نزدیک دامن قرطاس تنگ پڑ جاتا ہے اور انکا قلم بھی وہ کرب اوراق میں اُترانے سے عاجز رہ جاتا ہے، صرف ان کے پاس یہ جملہ اس قیام کو بیان کرنے کے لیے آخر میں کہنے کے لیے بچتا ہے کہ:

''مختصر یہ کہ جو بیتی وہ ایک اندوہ ناک کہانی ہے'' (۵۲)

آغا صاحب نے دورانِ قید اس ماحول کو قریب سے دیکھا تھا، وہاں جو مظالم قیدیوں پر ڈھائے جاتے تھے اور جو خباثتیں وہاں پائی جاتی تھیں ان کو بھی خودنوشت میں بالتفصیل جگہ دی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان زیادتیوں سے مصنف نفسیاتی طور پر کتنے متاثر رہے ہوں گے۔ انہوں نے اہل کاران زنداں اور سینئر قیدیوں کے مظالم کی جو تلخ داستان خودنوشت میں لکھی ہے وہ جہاں قید خانے کے مکروہ چہرے سے پردہ اُٹھانے کے لیے کافی ہے وہیں اس سے خود انکی اُس دور کی ذہنی کشمکش کا بھی سراغ ملتا ہے۔ اس قیام کا تجربہ ان عناصر میں سے ہے جس نے انکی شخصیت کی تشکیل میں لاشعوری سطح پر کام کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس ناقابل برداشت ماحول کی اسیری کا تذکرہ ان الم ناک الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''جیل خانے کے پتھریلے ضابطے کبھی نہیں سوچتے کہ انسان کے ساتھ پیٹ کی بھوک کے علاوہ ایک اور بھوک بھی ہے، پندرہ سولہ برس میں اس کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے، عمری تفاوت، فضا کی سنگینی، ضابطے کا شکنجہ اور قید کا پنجہ، بورسٹل کے بچوں کو اختلاط کی خواہشوں کا صید بنا دیتا ہے اور جو خراب نہیں ہونا چاہتے وہ بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ بڑے قیدی چھوٹے قیدیوں کو اپنی خوراک سمجھتے اور اُن کی عادتوں کو سہرا دے کر اپنے شہوانی ذوق کی تسکین کرتے ہیں، جیل خانوں میں (بچوں کے جیل ہوں یا بڑوں کے) شہوانی اختلاط کا مرض اس شدّت سے پایا جاتا ہے کہ محفوظ سیرت سرخ گندھک کی طرح کمیاب ہوتی ہے، ملازم وارڈروں کو بھی اس کی لت لگی ہوتی ہے اور شاذ ہی کوئی کم عمر قیدی اُن سے بچتا ہے، جہاں تک قیدی وارڈروں کا تعلق ہے جنہیں پنجاب کے جیلوں میں نمبردار، سرحد میں شین پوش اور سندھ میں مقدم کہتے ہیں تو ان کا وجود (الا ماشاء اللہ) جیل خانوں کے لیے ایک عذاب ہے، وہ ساتھی قیدیوں پر ظلم کرتے اور ایذا دہی میں ملازموں سے کہیں آگے ہوتے ہیں۔ اُس زمانے میں قیدی سگریٹ کے ایک کش پر خودسپردگی قبول کرتے اور تمبا کو کی ایک چٹکی (بیڑہ) کے لیے ردیف بن جاتے تھے۔......جیل خانے کی غایت اصلاح نہیں سزا

ہےاورسزا بھی انتقام کی حد تک بےرحمانہ! کوئی شخص قیدیوں کو انسان نہیں سمجھتا،انہیں جانور سمجھ کر ہانکتے اور ان سے اس قسم کی مشقت لی جاتی ہے جس سے ان میں عزت نفس کا احساس ہی نہ رہےاور وہ خود اپنے آپ کو جانور سمجھیں،جس شخص نے جیل مینول تصنیف کیا غالبًا اس کا کوئی بچہ نہیں تھا،لازمًا اولاد سےمحروم ہوگا،ایک آفسر کا خیال تھا کہ جیل خانے کی ملازمت یقینًا وہی شخص کرتا ہے جسے ماں باپ کی بددُعا ہو،جیل مینول سے زیادہ بھدی اور بُری کتاب آج تک کسی نے تصنیف نہیں کی.....جیل خانہ کے حکام اپنے ہونٹوں کی ہر جنبش کوقانون سمجھتے اور قیدیوں کو یوں گردانتے ہیں گویا وہ لوگ کبھی انسان نہیں تھے۔"(۵۳)

جیل کی زندگی شورش کاشمیری کے لیے جہاں بےشمار مصائب وآزمائشیں لے کے آئی وہیں انکی شخصیت کی تعمیر کے لیے یہ زمانہ نہایت سازگار بھی واقع ہوا۔انہیں اس طرح زندگی کو نزدیک سے دیکھنے اور جینے کا حوصلہ ملا۔یہ تجربہ انکی انسانوں کی نفسیات سے گہری آگاہی حاصل کرنے کا سبب بھی بنااور درد مند دل اور انسان دوست ہونے میں معاون بھی ثابت ہوا۔ساڑھے بارہ سال کی قید وبند کی صعوبتوں اوراندھیروں نے انہیں ایک کامل تجربہ کاراور جہاندیدہ انسان بنایا۔اس نے انکے قلب وذہن کوروشن کر دیا۔مختلف النوع حلقوں سے وابستہ اشخاص کی صحبت نے انہیں سیاسی رمزشناس ،تاریخ دان، دین اسلام کا عالم اور اسکی ترقی وتنزل کا گہرا شعور رکھنے والا صاحبِ دانش بنا دیا۔اس کا دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انکی طبیعت میں شورشی عناصر بھی ساتھ ساتھ پنپنے لگےاور مزاج میں کڑواہٹ بھی پیدا ہوگئی۔

آغا شورش کی مذہبی کشمکش کی بات کی جائے تو انکی پرورش وپرداخت مسلم معاشرے میں ہوئی، ماحول اور اساتذہ بھی اسلامی ملے لہذا نسلاً عام مسلمانوں کی طرح آغازِ جوانی تک مسلمان رہے،لیکن عقائد کی دنیا تب زیروزبر ہونا شروع ہوئی جب نئی کتابوں اور نظریات سے متعارف ہوئے۔انکے موروثی عقائد تاش کے پتّوں کی طرح بکھر گئے۔مارکسزم اور سوشلزم کی کتب نے انکے ایمان کی عمارت میں زلزلہ لایا۔نتیجہ یہ نکلا کہ ذات باری تعالٰی کے وجود میں شبہہ پیدا ہونے لگا اور دہریت کی طرف ذہن مائل ہوگیا۔اپنی اس مذہبی پراگندگی کی اُلجھن کوقارئین پرآشکار کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مارکسزم نے میرے دماغ کو ہلا ڈالا۔اس کی منطق کے سامنے فکرونظر سپر انداز ہوگئے۔ یہاں تک کہ میں خدا کی نفی پر کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا ہمنوا ہو گیا۔"(۵۴)

لیکن یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اس الحاد نے انکوتیں بڑے مسلم مفکرین کی کتب میں عیب تلاش کرنے کی تحریک وترغیب دی جو انکی ہدایت کا موجب بنا۔ وہ خودنوشت میں ارتداد کے بعد مراجعت کے سفر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی پر ایک چھوٹی سی کتاب ''خطبات مدراس'' مجھے دوبارہ مسلمان بنانے کا باعث ہوگئی۔.....(اس کتاب) سے مجھے یقین ہو گیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی سیرت سے افضل واکمل کوئی سیرت نہیں۔ اسلام میں واپسی کے بعد جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ گرویدہ کیا اور میں دماغاً پکا مسلمان ہو گیا وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن تھا، ترجمان القرآن نے مجھے ''خدا موجود ہے'' کے آستانہ پر جھکا دیا،......
> علامہ اقبال کے کلام نے مجھ میں اسلام کے لیے عصبیت پیدا کی اور میں محسوس کرنے لگا کہ اسلام فی الواقعہ ایک عصری طاقت ہے جس سے مسلمان معاشرے نے بہت کم فائدہ اُٹھایا ہے۔''(۵۵)

دین اسلام کی طرف پھر سے عقلی مراجعت کے بعد آغا شورش اس مذہب کے زبردست شیدائی بنے اور پھر تاعمر اسکے دفاع کے لیے جان تک دینے کے در پر رہے۔ خصوصاً ختم نبوت کے سلسلے میں وہ خودنوشت میں بہت جذباتی نظر آتے ہیں۔ اسکا عملی مصداق انکا قادیانیوں کو پاکستان میں خارج از اسلام کروانے کا کام سمجھا جاسکتا ہے۔ خودنوشت میں وہ تحریک ختم نبوت کو اپنی زندگی کو عظیم اثاثہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی آپ بیتی میں اکثر مقامات پر اسلام کے عروج وزوال اور مسلمانوں کی پستی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی حالت زار پر غور کرکے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی زبوں حالی کے پیچھے سائنسی ذہن کے بجائے شاعرانہ ذہن کی کارفرمائی اور زمانے کی نہج کے مخالف چلنا ہے۔ انکی اس دوررس رائے سے جہاں انکی اسلام کے تئیں گہری جذباتیت اور شیدائی ہونے کی دلیل ملتی ہے وہیں انکی گہری رمز شناسی کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ خودنوشت میں یہ بات بھی نمایاں طور دیکھی جاسکتی ہے کہ مصنف اسلام کی بالادستی کے لیے ہمہ وقت کوشاں اور سرگرم عمل رہے ہیں اور پستی سے تڑپتے ہیں۔ وہ مذہب کے بھیس میں منافقوں کی قلعی کھولنے میں بھی کسی طرح کا باک نہیں کرتے، وہ نام لے لے کر انکو اس سرگزشت میں بے نقاب کرتے ہیں اور انکے مکروہ عزائم سے لوگوں کو خبردار کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔

آغا شورش کی جوانی میں تقسیم ہند جیسا عظیم سانحہ بھی پیش آیا، اسکے بعد پھر فسادات کا نہ تھمنے والا سلسلہ بھی چل نکلا۔ انکی شدید حساس طبیعت اس سے نہایت متاثر ہوئی۔ یہی سبب ہے ہم خودنوشت کا بیشتر حصّہ فسادات اور تقسیم کے اندوہ ناک واقعات پر مشتمل پاتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ ان واقعات نے ان کے ذہن کو کس قدر جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا اور کیسا ارتعاش پیدا کیا تھا۔

شورش کاشمیری نے خودنوشت میں کئی ایک فسادات کے اسباب پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور اُن واقعات اور اُمور کا جائزہ لیا ہے جو ان انسانیت سوز حادثات کے باعث بنتے ہیں۔ اس کے بعد وہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ وہ جہاں غیر قوم کو کسی واقعہ میں موردالزام ٹھہراتے ہیں، تو وہیں اپنی قوم کی زیادتیوں پر بھی خاموش نہیں رہتے نہ پردہ ڈالتے ہیں۔ شہید گنج، نواکھالی، بہار، پنجاب اور لاہور جیسی جگہوں کے فسادات کی وجہ سے انکا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اکثریت کے ہاتھوں اقلیت کی تذلیل اور مظالم پر ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس کشت وخون اور بہیمیت پر انکا دل نالہ فرسا بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں خودنوشت سے مصنف کا فسادات پر ایک کرب انگیز اور لرزا دینے والا اقتباس یہاں پیش کیا جارہا ہے تا کہ آغا شورش کی نفسیاتی کشمکش ان واقعات کے تناظر میں دیکھی جا سکے:

> ''ہم ایک حویلی پر رُک گئے، باہر سے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس پر کیا بیتی ہے؟ اندر قدم رکھا تو ویرانی تھی، تمام چوبی دروازے نکال لیے گئے تھے، سامان لوٹ لیا گیا تھا، دیواروں پر لہو کی دھاریں تھیں، کپڑوں کو آگ لگادی گئی تھی، معلوم ہوتا تھا، تماش بین ایک عفیفہ کولوٹ کر اُسے ننگا کر گئے اور اس کے جسم پر زخموں کی چُنت پڑی ہے، میں اس لرزہ خیز حالت کو دیکھ کر سہم گیا، اور جب گاؤں کا مسلمان محلّہ دیکھا تو میرے بدن کا انگ انگ کانپ اُٹھا، جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ یاد آگیا کہ فاتح قومیں کس طرح آبادیوں کو برباد کرتی ہیں، برقعوں میں دوڑتی ہوئی لڑکیوں کے کٹے سر دیکھے، پستانوں کا ڈھیر، انگلیوں کی پوریں، سروں کا انبار، منجمد چہروں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں، اوپلوں کی آگ سے جلی ہوئی لاشیں، کتابوں کی راکھ، ٹوٹے پھوٹے برتن، پھٹی ہوئی دیواریں، چھتوں کے بڑے شگاف، مکانوں سے شہتیر غائب، زنانے میں کنواں، اور کنوئیں میں تعفن، انسان کے گوشت کی سڑاند، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا بجھا ہوا الاؤ، آگ کے ہاتھوں ساز وسامان پر کٹی پھٹی عبارتیں، فضاؤں نالہ نا

کشیدہ اور ہوا میں آہ نارسیدہ، شقاوت، بربریت، تعدّی استبداد، ہلاکت، بے رحمی، سنگ دلی اور خون ریزی کی منہ بولتی تصویریں، کیلوں سے ٹھکے ہوئے بچے، مقتول سہاگنوں کا لٹا پٹا سہاگ، مردہ چہروں پر خون آلودہ لٹیں، سورہ واللیل کا نالۂ اضطراب، بچوں کے پنجر، آنکھوں میں حیا کی آخری ہچکی کا انجماد، جان چھپاتی ہوئی عصمتوں کے پیازی آنسو، اور آنسوؤں میں خون کی ملاوٹ، کٹے ہوئے کانوں میں ٹھہری ہوئی بالیاں اور ٹوٹے ہوئے ہاتھوں میں پٹی ہوئی تالیاں یہ سب کچھ دیکھا تو میرے ہوش پرّاں ہو گئے۔......اُس رات مجھے ایک ثانیہ کے لیے بھی نیند نہ آئی، جاگتا رہا اور سوچتا رہا انسان اتنا درندہ ہو گیا ہے کہ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر آبادیاں قتل کی جاسکتی ہیں، محسوس ہوتا تھا میں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں، مجھے کوئی سوئیاں چبھو رہا ہے، میرے دل میں نشتر رکھ دئے گئے ہیں، میرے دماغ میں کیلیں ٹھونکی جارہی ہیں، مجھے احساس نے صلیب پر لٹکا دیا ہے۔"(۵۶)

آغا شورش کا ادب ظالم کے خلاف اور مظلوم کے حق میں صدائے احتجاج ہے۔ خودنوشت سے انکی انسان دوستی اور انصاف پسندی کے بھی کئی حوالے ملتے ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف ایک حوالے پر اکتفا کیا جارہا ہے:

"باہمی مشورہ کر کے ہم نے لاہور کے عوام کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا، احرار رضا کاروں کو کمر بستہ کیا، ......ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ریلوے اسٹیشن لاہور سے مسافروں کو اٹھا کر ان کے گھروں میں پہنچایا، پھر ہندوؤں کے نرغے سے مسلمانوں کو نکالا اور مسلمانوں کے نرغے سے ہندوؤں کو، ہم محلوں میں پھر پھر کر لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے، ان کے لیے سودا سلف لاتے، ہمارا یہ سلوک مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں سے یکساں تھا، ہم نے سینکڑوں ہندوؤں اور سکھوں کی جانیں بچائیں۔"(۵۷)

ان کی شاعری میں بھی اسی احساس کی ترجمانی ملتی ہے، چنانچہ انکا ایک مشہور شعر اس طرح ہے:

ہمارے بعد کہاں یہ وفا کے ہنگامے
کوئی کہاں سے ہمارا جواب لائے گا

غرض شورش جہاں ترش مزاجی کے لیے جانے جاتے ہیں وہیں وہ نہایت درجہ نرم دل بھی واقع ہوئے تھے۔ وہ انسانوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد ماننے والے شخص تھے۔ اسی متضاد طبیعت کو دیکھ کر میاں

امیرالدین بھی تبصرہ فرماتے ہوئے ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

''شبنم اور آگ کے اس امتزاج کا نام شورش کاشمیری تھا۔'' (۵۸)

سابقہ اوراق میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ آغا شورش ایک بلند پایہ اور شعلہ نوا خطیب، شاعر، سیاست دان اور صحافی تھے۔ ان سب میدانوں میں شہسوار ہونے کا احساس انہیں خود بھی تھا۔ خودنوشت کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے ان میں اس وجہ سے خودستائی اور نرگسیت پسندی کے عناصر بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے مشہور ادباء، فضلاء، علماء، سیاست دانوں سے مراسم کی روداد کو جس اُسلوب اور نوعیت کے ساتھ خودنوشت میں تفصیل سے جگہ دی گئی ہے وہ اس حقیقت کو باور کرانے کے لیے کافی ہے۔ ان کی خودستائی اور نرگسیت پسندی میں مبتلا ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آغا صاحب خودنوشت میں اپنی مقررانہ صلاحیتوں پر فخریہ انداز میں جا بجا نقارہ بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یوں خود کی ذات منوانے کے لیے ہر طرح کی سعی کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی صاف ہوتا ہے کہ انہیں یہ ڈر اندر سے ستائے جا رہا تھا کہ وہ کہیں فراموش نہ کر دیے جائیں۔ اس ضمن میں یہاں ان کی ایک معروف نظم ''ہمارے بعد'' کے چند اشعار کا حوالہ دینا بے جا نہ ہوگا:

فضا میں رنگ ستاروں میں روشنی نہ رہے

ہمارے بعد یہ ممکن ہے زندگی نہ رہے

اس انجمن میں عزیزو یہ عین ممکن ہے

ہمارے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہے...... (''ہمارے بعد'' نظم)

یا انکا یہ شعر بھی اپنے آپکو منوانے کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے:

تاریخ مرے نام کی تعظیم کرے گی

تاریخ کے اوراق میں آئندہ رہوں گا...... (''ہمارا جواب پیدا'' نظم)

بہرحال! یہاں خودنوشت کے ایک اقتباس سے ان کی مقررانہ خوبیوں پر خودستائی کے احساس کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو بالفاظ دیگر نرگسیت پسندی کا ہی دوسرا روپ ہے:

''میں کھڑا ہوا تو رنگ ہی دوسرا تھا، مجھے اس تقریر پر ہمیشہ فخر رہے گا، مجمع میری مٹھی میں تھا،

میں الفاظ سے گویا انسانی عقلوں کو شکار کر رہا تھا، جانے کیا جذبہ تھا جس نے انسانوں کو مسحور کر لیا تھا، میں عوام کو بہا کے لیے جا رہا تھا اور لوگ چلے جا رہے تھے، لوگ اتنے غضب آلودہ ہو گئے کہ پورا امرتسر ہل سکتا تھا۔ میں خود خطابت کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔'' (۵۹)

اب آخر میں شورش کاشمیری کے آخری دور کا جائزہ لیتے ہیں جسے وہ ''دودِ چراغ محفل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ خودنوشت کے مجموعی مطالعے کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ دھواں وہ دھواں ہے جس نے چراغ کو اپنے دورِ شباب میں دیکھا تھا۔ یہ وہی دھواں ہے جس نے محفل میں ہر طرح کے لوگ دیکھے ہیں۔ یہ وہی دُھواں ہے کہ جو اس بات کا گواہ رہ چکا ہے کہ شورش کے چراغ نے کتنے چراغوں کو روشن کیا ہے، اور اس بات کے لیے انہیں کبھی سراہا گیا لیکن اکثر بے قدری ہی نصیب ہوئی۔ یہ وہی دُھواں ہے جسے خود کے ختم ہونے کا ڈر ہے اور اسی لیے آخر میں خودنوشت کو اپنی ذات منوانے اور یاد رکھنے کے لیے چنا ہے۔ یہ وہی دھواں ہے جو اپنی تمام عمر کی حسرتوں اور محرومیوں کو ظاہر کرنے کے لیے سرگرداں پھرتا ہے۔ ان سب اشارات پر اگر نفسیاتی اعتبار سے غور کیا جائے تو شورش صاحب کی تمام عمر کی شخصی تشکیل سامنے آجاتی ہے۔ اس لیے کہنا مناسب ہوگا کہ اپنی عمر کے آخری حصّے کو اس معنیٰ خیز ترکیب سے معنون کرنا معقول بات ہے۔ اس مماثلت و مطابقت کو نظر میں رکھ کر اب اگر ان کی ساری زندگی یعنی بچپن کی محرومیوں، جوانی کی حسرتوں اور بڑھاپے میں نرگسیت پسندی کے ساتھ جذبۂ سخاوت و احسان کو بہ نگاہ عمیق دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مصنف کی ناؤ کشمکش کے بھنور میں گرفتار ہے اور احساس کمتری و برتری کا پنڈولم درمیان میں لٹک رہا ہے۔ یہ حالت گہری نفسیاتی کشمکش کی طرف اشارہ ہے۔ اپنی اس طرح کے حالت زندگی کو شورش کاشمیری ان الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

''لڑکپن نے اپنی عنان بڑھاپے کو سونپ دی جوانی بیچ میں اس طرح سے اُٹھ گئی جیسے کوئی نازنین پہلو چھڑا کر نکل جائے اور آتشکدۂ خیال میں مسرتوں کی چنگاریاں رہ جائیں۔''

(۶۰)

آغا شورش کی خودنوشت لکھنے کے پیچھے جو محرکات ہیں وہ بھی اب تک کی بحث کو سامنے رکھ کر اب واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ محرکات بذاتِ خود مصنف کی نفسیاتی کشمکش کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ احساس کمتری و محرومی کے شکار ہیں اور اسکی تلافی کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ اسے احساس

برتری میں بدل سکے اور خود کو تسکین پہنچا سکے۔ انکی سوانح کی شروعاتی صفحات میں ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے ایک تحریر ملتی ہے جو اسی احساس کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں جو تجربات انہوں نے حاصل کیے ہیں وہ آگے منتقل ہوں، تاکہ اگر خود انکی حسرتیں تشنہ طلب رہی ہیں لیکن کم از کم انکے پڑھنے والے ہی انکی کوششوں اور تجربات سے آگاہی حاصل کر سکیں اور مستفید ہوں نیز وہ کسی صورت بھلا نہ دئے جائیں۔ یہاں اریکسن کے نظریہ سخاوت کی روشنی میں بھی اس عمل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ خیر مصنف خودنوشت کے محرک کو ان دبے الفاظوں میں بیان کرتے ہیں:

''میں کیا اور میرے سوانح کیا؟
یہ کہانی اس لیے لکھ دی ہے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔''

اسی طرح ایک باب ''ایک تجربہ۔ ایک مطالعہ'' میں اسی احساس کی بازگزشت ان الفاظ میں ملتی ہے:

''انسانوں کے تجربے بڑی چیز ہوتے ہیں، لوگ دوسروں کے تجربے سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور نہ اُن سے سبق لیتے ہیں، بلکہ خود تجربہ کرتے ہیں لیکن اِس قسم کے تجربے ضرور محفوظ رہنے چاہیں۔ ہمارے ملک میں ان تجربوں کو محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہی تجربے ممکن ہے کبھی نئی پود کے لیے غلطیوں سے اجتناب کا ذریعہ بن جائیں اور لوگ ان رہبروں سے بچیں جن کی رہزنی ڈھکی چھپی ہوتی ہے۔'' (٦١)

ان دو اقتباسات کی تحلیل نفسی سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ آغا شورش جہاں ایک طرف اپنی سخت قسم کی احساس محرومی میں مبتلا ہیں وہیں خودنوشت میں اکثر مقامات پر اپنی خطابت، شجاعت، سیاست، سخاوت، مصاحبت، رفاقت اور بغاوت کے مبالغہ آمیز تذکرہ سے پس پردہ دراصل وہ احساس برتری کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں، جو اُن میں احساس کمتری کے باعث پیدا ہوگئی ہے۔ انکا یہ شعر اس ساری صورت حال کا غماز ہے: ؎

ہم نے کیا ہے گردش دوراں کو پائمال
ہم نے سہے ہیں زخم زمانے کی چال کے

(نظم: ''ہجر و وصال''۔ شورش کاشمیری)

''آپ بیتی'' (۱۹۷۸ء) مولانا عبدالماجد دریا آبادی

مولانا عبدالماجد دریا آبادی ایسی جامع الحیثیات اور قاموسی شخصیت کی حامل ذات ہے، جنہیں مذہب، عمرانیات، فلسفہ، تاریخ اور تہذیبی زندگی کے تمام شعبہ ہائے پہلوؤں پر کامل دسترس حاصل تھی۔ ''آپ بیتی'' انہی کی بیاسی سالہ زندگی پر محیط خودنوشت ہے جو ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آئی۔ ۴۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ سنجیدہ نوعیت کی آپ بیتی خودنوشت نگاری کی روایت میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا دریا آبادی کی زندگی میں شروع سے آخر تک ایک نمو، ارتقا پزیری اور تحرک کا تسلسل ملتا ہے۔ ان کی خودنوشت زندگی کے گوناگوں تجربات و مشاہدات کا البم ہے۔ اس میں انکی پیدائش، بچپن، خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، جنسی و ازدواجی زندگی، سیاست، تقسیم و فسادات، مذہب و الحاد اور نیرنگِ زمانہ پر مبنی حالات و واقعات کی بسیار تفصیل و تنقید ملتی ہے۔ اس طرح یہ خودنوشت خارجی اور داخلی کشمکشوں کا ایک وسیع دفتر اپنے اندر سموئے ہوئی ہے۔ اس خودنوشت کے بارے میں اکثر اس رائے کا اظہار پایا جاتا ہے کہ اس میں خارجی عناصر کی بہتات ملتی ہے لیکن امر واقعہ یہ بھی ہے کہ بیرونی کشمکشوں کی ہمہ گیری مصنف کی گہری نفسیاتی کشمکش کو زیادہ بہتر طریقے سے آشکار کرتی ہے۔ مولانا کی کثیر الجہات شخصیت کی، زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستگی تھی، انہوں نے عمر کی بچاسی بہاریں دیکھیں ہیں، لہذا خودنوشت میں موضوعات کی بوقلمونی کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں سمجھی جاسکتی، نہ عیب ہی شمار کیا جا سکتا ہے، ہاں صرف اتنا اہم ہے کہ مصنف نے واقعات کو بیان کرنے میں صداقت و دیانتداری سے کام لیا ہو۔ اس حوالے سے اگر مصنف اپنے مندرجہ اقوال پر پورے اُترتے ہیں تو یہی خودنوشت کی شرطِ اولین ہے:

''راست گوئی کا جو حق ہے اسے زبانِ قلم سے اپنے حق میں ادا کرنا بجز نبی معصوم کے اور کس

کے بس کی بات ہے؟ ہم ایسوں کے لئے یہی بہت ہے کہ قلم کا دامن کذبِ صریح و افتراء مبین سے آلودہ نہ ہونے پائے۔" (۶۲)

مزید ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

"ہر دور میں وہی لکھا جو اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق تھا قلم سے وہی ٹپکا، وہی چھلکا جو دل ودماغ کے اندر موجود تھا۔ جب الحاد کی شامت سوار تھی، تو رنگ تحریر ملحدانہ تھا۔ جب اسلام کی حلقہ بگوشی از سر نو نصیب ہوئی تو وہی رنگ تحریر کا بھی ہو گیا...... اللہ نے ہر صورت میں مخالفت ضمیر کی بھٹی میں گرنے سے محفوظ رکھا۔" (۶۳)

تاہم خودنوشت میں مرقوم واقعات کی صداقت پر کتنا اعتبار کیا جا سکتا ہے، اور مولانا دریا آبادی کی مجموعی زندگی میں صداقت وحق گوئی کا کیا معیار تھا اس بابت ضروری معلوم ہوتا ہے کسی محقق کی رائے کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ اس ضمن میں تحسین فراقی کا ان کے متعلق تبصرہ درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک مصلح ملت کی طرح یہاں (خودنوشت میں) ان (ماجد دریا آبادی) کا تبلیغی اور اخلاقی مشن غالب ہے لیکن اس کی چاشنی بہرحال ہلکی ہے اور آپ بیتی کے تقاضوں کو مجروح نہیں کرتی۔ صاف گوئی اور صداقت شعاری کا جیسا قابلِ فخر معیار انھوں نے اپنی دیگر تحریروں اور خصوصاً صحافت میں قائم رکھا ہے وہ یہاں (خودنوشت میں) ہرگز نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ شادی سے قبل زمانہ قیام لکھنؤ میں ان کے نفس بہیمی نے جو ایک آدھ دفعہ ہاتھ پاؤں نکالے، اس کا بھی اجمالی مگر صاف گوئی سے ذکر کر دیا ہے۔" (۶۴)

"آپ بیتی" خودنوشت میں مولانا دریا آبادی کی منجملہ شخصیت کے اوصاف خصوصاً آخری عمر کے رجحانات اور میلانات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ خودنوشت کے مطالعے سے قارئین پر جو بات آغاز میں ہی مترشح ہوتی ہے وہ مصنف کے پیش نظر اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر کا مقدم ہونا ہے اور احساس ندامت وگناہ ہے۔ نفسیاتی رو سے اگر اسکی توجیہ تلاش کی جائے تو یہ بات کھلتی ہے کہ یہ دراصل انکی احساس کمتری اور احساس گناہ کی تلافی کا نتیجہ ہے جو مصنف کو اپنے سابقہ اعمال، محرومیوں، احتیاج، دنیا کی اصل حقیقت کے کھل جانے کے احساس اور تلخ تجربات سے حاصل ہوئی تھی۔ ایسے ہی اگر خودنوشت کے محرک کی بات کریں تو اس کی وجہ تخلیق سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مولانا کا لاشعور جو مدتوں خواہشوں اور تجربات سے پرورش پا رہا تھا، عمر کے آخری ایام میں حادثے کی صورت میں اس خودنوشت کی شکل میں ظہور میں

آیا۔ بالکل اس شعر کے مصداق کہ ؎

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

(قابل اجمیری)

غرض خودنوشت میں انکا محرک کے بارے میں خود اظہار خیال کرنا یہ روشن کرتا ہے کہ یہ اعتراف جرم اور قارئین کے لیے عبرت ونصیحت کے لئے لکھی گئی ہے، اور اس عمل کے اظہار سے انہیں تسکین وآسودگی کا احساس ملتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو یہ انکشاف انکی داخلی کشمکش کو صاف طور سے روشن کرتا ہے اور انکے قلب وذہن میں بسی ان چھپتی ہوئی باتوں کو ظاہر کرتا ہے جن کا اعتراف ان کے ضمیر یا فوق انا کو کسی درجہ سکون و راحت پہنچاتا ہے۔ چنانچہ ماجد صاحب اس بابت اپنے لاشعور تک رسائی دیتے ہوئے ''آپ بیتی'' کے دیباچے میں اپنی نفسیاتی کشمکش کو قارئین پر ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عجب کیا کہ اللہ کے بعض بندے کچھ سبق اس خرافات نگاری سے حاصل کرلیں، اور اس کوڑے بلکہ گھورے کے ڈھیر کو [illegible] یدکر عبرت کے کچھ موتی اس سے چن لیں، اور جس نے ساری عمر تباہ کاری کی نذر کردی، اس کے بگاڑ سے اپنے بناؤ کا کچھ سامان فراہم کرلیں۔'' (۶۵)

مولانا دریا آبادی کی شخصیت کو جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اُس ماحول کا جائزہ لیں جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پرداخت پائی۔ انیسویں صدی کے آخری دہے میں برطانیہ اور ملکہ وکٹوریہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط واقتدار مستحکم تھا، صرف سیاسی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ علمی، تعلیمی، تہذیبی، تمدّنی غرض دنیوی زندگی کے ہر شعبے میں اُن کو برتری حاصل تھی حتیٰ کہ دینی زندگی کے بھی مختلف شعبوں میں وہ زور آور تھے۔ مسلمان ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اسکے ہولناک نتائج کے بعد احساس کمتری کے شکار ہوگئے تھے اور خیریت اسی میں سمجھتے تھے کہ ہاں میں ہاں ملائے جائیں۔ جو طبقہ مسلمانوں میں آسودہ حال تھا ان میں اکثریت اخلاقی پستی کی شکار ہوگئی تھی۔ خودنوشت نگار اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ وہ خودنوشت میں ان طبقات کی تفریق وعدم مساوات، بداخلاقی، بد

عنوانی، مذموم اشرافیت اور جاگیردارانہ نظام کی قلعی کھولتے ہیں۔ جس سے بچپن میں ہی ان کے حساس ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ مولانا خود ایک نہایت متمول اور معیاری گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور انہیں یہ موقع ملا تھا کہ وہ جاگیردارانہ سماج کی پیدا کردہ مصنوعی اور کھوکھلی زندگی کا موازنہ سماج میں بس رہے دوسرے طبقات کے ساتھ کر سکے۔ ہاں یہ بھی ایک قدرتی عمل ہے کہ انہوں بھی کسی نہ کسی درجہ میں اس ماحول سے اثر قبول کیا تھا۔ اس سلسلے میں ذیل کا اقتباس جہاں مصنف کی ناقدانہ بصیرت اور حساس دل رکھنے کا سراغ دیتا ہے تو وہیں اُس زمانے کی نیرنگیوں اور کشمکش کا بھی ادراک دلاتا ہے بلکہ کہنا چاہیے اودھ اور لکھنؤ کا سماج اپنے تمام حسن و قبح کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے:

> ''نائی، دھوبی، بہشتی (سقہ) دُھنیے، جولاہے، لوہار، بڑھئی، مزدور، کسان، قلی، وغیرہ سارے پیشہ ور 'کمینے' قرار پا گئے تھے، اور شرافت کا معیار یہ ٹھہ گیا تھا کہ نسب میں ''میاں لوگوں' کی ٹکر کا کوئی بھی نہیں، اور اونچی اور شریف ذاتیں صرف شیخ و سیّد میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں، اور پھر باہم ان میں بھی تفاضل اور شیخوں کی شیخی کی کوئی حد ہی نہیں، اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنا سو عیبوں کا ایک عیب اور سو ذلّتوں کی ایک ذِلّت۔ تجارت دوکانداری، کاشت کاری سب میں ہماری سُبکی اور توہین۔.........خدمتی پیشے والے (نائی، منہار، کنجڑے، قصائی وغیرہ) سب پَر جا یا رعایا کہلاتے تھے، ان کی نہ کوئی عزّت نہ ان کی عورتوں کی کوئی عصمت۔ ہم میاں لوگ ان سب کے مقابلہ میں فرعون بے سامان بنے ہوئے۔ مجال نہیں کہ جب کوئی میاں لوگ اپنے بیٹھکے میں ہوں تو کوئی نیچ قوم کا لڑکا یا جوان ان کے سامنے سائیکل پر گزر سکے!''(٦٦)

ایک اور اقتباس یہاں درج کرنا اس زمانے اور ماحول کو واضح کرنے میں ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اُس دور کی جملہ تہذیبی، مذہبی، تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی کشمکش کا نقشہ سامنے آسکے:

> ''اگست ۱۹۴۷ء تک سارا ہندوستان انگریزوں کے تابع تھا۔ پاکستان بنا تو پنجاب اور بنگال دو دو ٹکڑے ہوکر پاکستان میں شامل ہوگئے اور سندھ و بلوچستان کے مسلمانوں کی آبادی تقریباً دس کروڑ سے گھٹ کر ساڑھے چار سے پانچ کروڑ رہ گئی۔ خاندان کے خاندان مسلمانوں کے، خصوصاً یوپی کے مسلمانوں کے اجڑ گئے، مٹ گئے اور کٹ گئے، ایک بھائی یہاں، دوسرا اوہار۔ باپ اِدھر تو بیٹا اُدھر۔ وہ افراتفری پڑی اور اکھاڑ پچھاڑ ہوئی کہ خدا کی

پناہ۔اور لکھ لکھا مسلمانوں کی جو جانیں گئیں،عزتیں مٹیں، عصمتیں لٹیں،اور کروڑوں کا مالی نقصان ہواان کا تو کوئی حساب ہی نہیں!ہندوستان کی حکومت سرکاری کاغذوں پر ''نامذہبی'' قرار پائی۔لیکن عملاً گاندھی جی اور جواہر لال نہرو وغیرہ کی تو تھمبو کے باوجود بڑی حد تک ہندوحکومت بن گئی۔مسلمان ہراس زدہ اور حواس باختہ احساس خودداری کھو بیٹھے۔اور ہر معرکہ میں ''اکثریت''اور حکام اور پولیس کے ہاتھوں پٹنے اور مار کھانے لگے۔

میرے بچپن تک مسلمانوں کا ایک مخصوص معاشرہ تھا،خصوصی آداب واطوار تھے،خاص قسم کا لباس،خاص قسم کے بال،خاص قسم کے کھانے پینے وغیرہ ہا۔تغیّر وانقلاب کی آندھی نے یہ سارا شیرازہ منتشر کر دیا پہلے تو انگریزیت کا دَور دَورہ رہا۔وضع قطع،مکان ولباس، کھانا پینا سب مغربی طریق کا ہوتا چلا گیا۔اور پھر اب ہندو تہذیب و معاشرت کا سیلاب آیا،جو نظام تعلیم و نصاب تعلیم کی مدد سے ساری ہی انفرادیت اسلامی کو بہائے لئے جا رہا ہے۔احساس کمتری کے ساتھ ساتھ،ہندوؤں کی رضا جوئی اور خوشامد کا جذبہ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔اور معاشری،علمی،تہذیب مرعوبیت سے لے کر اعتقادی،اور دینی ارتداد تک کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔...... نئے فیشن کی پیش قدمی پوری تیزی سے جاری تھی، ''قدیم وجدید'' کی آویزش قدم قدم پر تھی،اور قدیم ہر محاذ پر اور ہر میدان میں شکست پر شکست کھا رہا تھا،زک پر زک اٹھا رہا تھا۔سارے شعار اسلامی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے،اور ''اقبال سرکار''اور دانایان فرنگ'' گویا ہر مسئلہ میں ''سند'' کا درجہ رکھنے لگے تھے۔''(٦٧)

بچپن میں گھریلو تعلیم و تربیت اور مذہبی ماحول کی بدولت ماجد صاحب ابتدا سے ہی بہت حد تک شائستہ مذاق رکھتے تھے۔صغرسنی کے دور سے ہی ان میں اخلاقی اور انسانی شعور بیدار اور تربیت یافتہ نظر آتا ہے۔خانگی پاکیزگی کے باعث وہ لغویات سے باقی ہم عمروں کے برعکس محفوظ اور حتی المقدور اپنا دامن بچاتے ہوئے خودنوشت میں دکھائی دیتے ہیں۔چنانچہ اپنے تعلیمی دور کی خباثتوں اور خانگی ماحول اور تعلیمی ادارے کے ماحول کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ کشمکش کا اظہار خودنوشت میں وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اسکول میں قدم رکھ کر جو چیز سب سے زیادہ نئی اور عجیب وہاں دیکھنے میں آئی وہ وہاں کی زندگی میں فحش کی آمیزش تھی فحش کلامی بھی اور فحش کاری بھی۔لڑکے آپس میں وہ فحش گوئی کرتے اور بے تکلف اور بے جھجک وہ گالیاں زبان پر لاتے کہ گھر میں خیر انھیں سنتا تو کیا،

کبھی خیال میں بھی وہ نہ آئیں اور ادھر ماسٹر کی نظر پڑی، کہ اُدھر کلاس میں ننگا پن شروع ہو گیا زبان سے گزر کر کبھی عملی بھی، تفصیل کاغذ کے صفحے پر کیسے سب لائی جائے اور کم سن ہونا تو گویا مہا پاپ یا جرمِ عظیم تھا۔ کوئی کمسن لڑکا، خصوصاً اگر ذرا بھی قبول صورت ہوا پنے اوباش ساتھیوں کی زد سے بچ ہی نہیں سکتا تھا____ اور یہ حال جب ۱۹۰۱ء میں تھا تو ۱۹۶۷ء کی ترقیوں کا تو پوچھنا ہی کیا؟'' (۶۸)

مولانا ماجد کی طبیعت میں بچپن سے ہی ایک طرح کا شرمیلا پن تھا، اس دروبیں مزاج کا اثر اخیر عمر تک انمیں رہا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کے ساتھ ملنے اور بات کرنے میں جھجک محسوس کرتے تھے۔ کسی کے سامنے کھل کر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرنا انکے لیے دشوار عمل بن جاتا جاتا تھا۔ آس پاس کے بچوں کے ساتھ میل جول کی کمی اور قبول صورت نہ ہونے کا احساس بھی لاشعور میں ان کی نہائی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما ہو رہے تھے۔ خودنوشت میں انہوں نے اکثر مقامات پر اس طرح کی طبیعت کے بارے میں آگاہی دی ہے۔ بطور نمونہ بچپن کے ایک واقعہ کا ذکر ''آپ بیتی'' میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

''زمانہ یہی کوئی اخیر ۱۸۹۵ء کا ہوگا کہ ایک سہ پہر کو بعد عصر، وہیں لکھیم پور میں زنانہ مکان کے صحن میں تخت پر فرش بچھا دیا گیا، گھر والے جمع ہوئے۔ اور مجھے مولوی صاحب کے سامنے بسم اللہ پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ اور رسوائی زندگی کی پہلی رسوائی کا تماشہ اب شروع ہونے کو ہوا۔ ادگرد عزیز، دوست، ملازمین کچھ کھڑے ہوئے کچھ بیٹھے ہوئے، والدہ وہمشیرہ وغیرہ چلمنوں کی آڑ سے ادھر آنکھیں لڑائے ہوئے ہے۔ سب کے چہروں سے مسرت ٹپکتی ہوئی، لیکن یہ کیا، دیر ہوتی چلی جاتی ہے اور ضدی لڑکے کی زبان پر بسم اللہ نہیں آئی! مزاج میں شرمیلا پن پیدائشی تھا، وہ اس وقت اور کیسی بری گھڑی رنگ لایا جھٹ سے فرفر سنا دینا الگ رہا، یہ بھی نصیب نہ ہوا کہ اٹک ہی اٹک کر کچھ تو زبان سے نکالتا ایک دم چپ ہو گیا۔'' (۶۹)

اپنی شکل وشباہت کے حوالے سے مولانا دریا آبادی منفی تاثرات رکھتے تھے۔ بچپن سے لیکر آخری عمر تک انکے لاشعور میں اپنی بدنمائی کا کھٹکا تھا۔ اس سے جو احساس کمتری ان میں پیدا ہوئی اسے نیچے درج کئے گئے اقتباس میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے:

''اپنی صورت اکثر لوگوں کو اچھی لگتی ہے، اس لئے آئینہ بھی خوب دیکھے جاتے ہیں، اپنا حال

اس کے برعکس ہے، اپنی صورت بدترین سمجھتا ہوں، اسی لئے آئینہ کبھی نہیں دیکھتا ہوں، کہیں ریل کے سفر میں راستہ گلی میں گزرتے ہوئے کوئی بڑا آئینہ اتفاقاً سامنے پڑ جائے تو بات دوسری ہے۔ اپنی بے ہنگم داڑھی چہرے پر پھیلی ہوئی اور بھی وحشت افزا ہے لیکن اپنی صورت کی ناپسندیدگی داڑھی رکھنے کے دور سے قبل کی ہے، اس کے بعد قدرۃً اپنی تصویر کھنچوانا ناپسند کرتا ہوں۔"(۷۰)

اسی طرح اپنی تنہائی پسندی، شرمیلے پن، اور اشتعال انگیزی سے خائف ہونے کے مزاج پر بھی خودنوشت میں ذکر ملتا ہے۔ یہ طرزِ عمل بھی احساس کمتری کو ہی واضح کرتا ہے۔ چنانچہ اس اقتباس کو اس ضمن میں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا:

"طبیعت زیادہ ملنے جلنے کی خوگر نہیں..... زبانی بحث و مباحثہ سے بہت گھبراتا ہوں، اس کی ایک وجہ طبعی شرمیلا پن ہے، زبان بے دھڑک کھلتی نہیں ہے، دوسرے اپنی اشتعال پذیری سے بھی ڈرتا رہتا ہوں، معلوم نہیں غصہ میں کیا کچھ زبان سے نکل جائے۔"(۷۱)

ماجد صاحب کے لاشعور میں یہ بات شعور کی آنکھ کھلنے کی ساتھ ہی رچ بس گئی تھی کہ انکی شکل و شباہت بہتر نہیں ہے۔ دوسری جانب وہ فطرۃً کم گو ہی واقع ہوئے تھے۔ ان وجوہ کے بسبب وہ خلوت نشینی کی طرف مائل ہوئے ان محرکات کا جو منفی اثر انکے لاشعور پر پڑا اس نے احساس کمتری کی کشمکش کا در کھول دیا۔ اس کے فوری نتائج جو بچپن میں برآمد ہوئے وہ انکی طبیعت میں برگشتگی اور ضدی پن کا آنا تھا۔ خودنوشت سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا خاندان اپنے وقت میں قدرے آسودہ حال تھا۔ انکے گھر میں ہمہ وقت خدمت گار حاضر رہتے تھے۔ ماجد صاحب کو ان ملازمین پر ایک طرح کا اختیار حاصل تھا۔ وہ اپنا سارا انتقام اور فرسٹریشن وہاں موجود ماتحتوں پر نکالتے تھے۔ یہ ردِعمل درحقیقت احساس کمتری کی تلافی کا شاخسانہ تھا، جسے وہ احساس برتری کے جذبے کے ساتھ نکالتے تھے۔ پھر یہ کہ گھر میں کوئی خاص روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں تھا۔ الٹا ان اُمور پر کچھ لوگوں کی طرف سے داد و تحسین ہی ملا کرتی تھی۔ اس مسلسل عمل سے انہیں برتری کا احساس ہوتا تھا اور تسکین ملتی تھی۔ خودنوشت میں نوکروں اور زیردستوں پر ڈھائے گئے مظالم کے احوال رقم بند کرنے اور بعد میں پچھتاوے کے ذکر سے مصنف کی اس کشمکش کی طرف راہنمائی ملتی ہے نیز خودنوشت کے حوالے سے مصنف کو مرکزی حیثیت دے کر اگر اس دور کے اشراف و امراء

کے اجتماعی لاشعور کو بھی سامنے رکھا جائے تو اس زمانے، خاص کر لکھنؤ کی معاشرتی اور طبقاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ خودنوشت نگار کی نفسیاتی کشمکش پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ ماحول کا کسی شخص کی ذہنی تشکیل میں کتنا اہم رول رہتا ہے۔ یہ اقتباس ان دعوں کی بھرپور توثیق کرتا ہے:

''ملازم یا خدمت گار اتنی زندگی میں میرے پاس کئی ایک رہے، زیادہ تر گھر ہی کے پرور دہ۔ زمانہ لڑکپن اور جوانی کا میں نے وہ پایا جہاں بچاروں کے کوئی انسانی حقوق تھے ہی نہیں اور ان کا شمار بس ایک طرح کے معزز جانوروں میں تھا۔ آنکھ کھول کر برادری بھر میں یہی منظر دیکھا اور پھر میں تو گرم مزاج وتندخو بھی تھا۔ قدرۃً اس سارے طبقہ کے ساتھ برتاؤ ناگفتہ ہی رہا۔ کس کس سے معافی کیا کہہ کہہ کر مانگوں؟...... مدتوں میری خدمت میں ایک نو مسلم شخص شعبان علی نامی رہے، مجھ سے سن میں دو تین سال بڑے۔ اپنے بالکل بچپن میں کہیں سے لاوارث ہو کر میرے ہاں آ گئے تھے، اور میرے ہی سر (حسب و رواج خاندان) چپکا دیئے گئے۔ ''میاں لوگوں'' کے ہاں خدمت گاری اس وقت لفظاً وعملاً غلامی کے مترادف تھی، وہی سب ان پر بھی گزرتی رہی۔ آج ان وحشیانہ سختیوں کا خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔...... ان کے حقوق میں وہ شیطانی خیانتیں کیں کہ صفحۂ کاغذ پر انھیں منتقل کرنے کی ہمت کسی طرح نہیں۔'' (۷۲)

مندرجہ بالا حوالہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ انکی شخصیت کی تشکیل میں ماحول نے بھی کافی رول ادا کیا ہے۔ بعدازاں، ان میں آتش مزاجی اور سراسیمگی اختیار واقتدار کی شہ ملنے کے باعث افزوں ہوتی رہی۔ یہ عمل انکی طبیعت میں جزبۂ حاکمیت اور خودسرائی لانے کا موجب بنتا رہا۔ اس بات کا مصنف کو خود بھی اعتراف ہے، چنانچہ وہ اپنی تند و سرکش مزاجی کا اعتراف کرتے ہوئے اور اپنی تلون طبع پر روشنی ڈالتے ہوئے ''آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:

''طبیعت عادی شروع ہی سے حکومت وحکمرانی کی ہو گئی، اور نفس کو چسکا بچپن ہی سے اپنی بڑائی کا پڑ گیا۔ ساتھیوں سے احساس مساوات کا پیدا ہی نہ ہونے پایا۔'' (۷۳)

ماجد صاحب اپنی اُفتادِ طبع سے پردہ سرکاتے ہوئے اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ مزاحمت کی صورت میں انکی طبیعت مزید مشتعل ہو کے بغاوت وانتقام پر اُتر آتی ہے جبکہ نرمی کی صورت میں جھلاہٹ و سرکشی کا اثر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ وہ اس ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سرشت کی افتادہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ادھر کسی نے سختی کی، اور اُدھر طبیعت مقاومت وبغاوت پر تُل گئی، اور ادھر کسی نے نرمی سے کام لیا اور ادھر اپنی طبیعت بھی مروت سے دب گئی، ڈھیلی پڑ گئی، عمر بھر طبیعت کی کجی قائم رہی اور مظاہرے، ناشائستگی کے ہوتے رہے۔ آہ، یہ بدسرشتی جس کی اصلاح عمر کی آخری منزلوں میں بھی نہ ہو سکے! اسی کو کہتے ہیں: ع

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو!'' (۷۴)

مولانا ماجد کے ایسے مزاج کے پس پردہ احساس کمتری کے جزبہ کو کارفرما مانا جاسکتا ہے جسے وہ احساس برتری میں تبدیل کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ان کی حاکمانہ سوچ اسی کشمکش کی تلافی کا نتیجہ ہے۔ انکی احساس محرومی، مزاحمت کی صورت میں اور کُھل کے سامنے آتی ہے۔ جنس کے حوالے سے بات آگے تفصیل سے آئے گی لیکن یہاں نمونے کے طور پر ایک اقتباس کو نقل کیا جارہا ہے جس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ مزاحمت کی صورت میں ناکامی وحسرت ملنے پر، خودنوشت نگار کی نفسیاتی کشمکش کون سا رنگ اختیار کرتی ہے:

''غصّہ ور، تندخو میں شروع ہی سے تھا، غصّہ چہیتی بیوی پر بھی شروع کر دیا، شادی کے دو ہی ایک مہینہ بعد، وہ بچاری حیران کہ میں تو انھیں اپنا پرستار سمجھتی تھی یہ جلاد کیسے نکلا، اپنا ہی نادری حکم چلانا چاہتے ہیں۔ دعویٰ عشق وفرمانبرداری کا تھا، مگر اب تو یہ حاکم بن کر رہنا چاہ رہے ہیں! ____ غصّہ وطیش کے لئے ضرورت کسی بڑے محرک اور قوی سبب کی نہ تھی، روزانہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعہ اس کے لئے کافی تھے،......عفریتِ غصب کے ساتھ جو دوسرا بھوت، جوانی بھر سر پر سوار رہتا ہے وہ جو لذت صرف کبھی کبھی حاصل کر لینے کی ہے نفس کو تقاضا یہ رہتا ہے کہ اسے دن رات حاصل کرتے رہیے، اور ساری طبّی ہدایتوں کو پامال کرتے اور قوت کے ذخیرے کو پوری بے دردی واسراف کے ساتھ لٹاتے رہیے۔ بیوی کی عارضی جدائی بھی کھلنے لگی اور زچگی یا علالت کے سلسلے میں کئی کئی ہفتے کی علٰحدگی تو وبال جان بن گئی۔'' (۷۵)

مولانا دریا آبادی کو اپنی گرم مزاجی کے حوالے سے آغاز جوانی میں کسی خاص قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ عنفوان شباب کے دور الحاد میں کثیر مطالعہ اور باقیوں کے بنسبت اعلیٰ معیار زندگی اور تعلیم نے اس مزاج میں اضافہ کرتے ہوئے آگے جاکر انانیت وکبر اور خود پرستی کے عناصر

کی ترقی یافتہ شکل کو جنم دیا لیکن آخری عمر میں انکا اس عمل پر نادم ہونا ہر صورت میں کشمکش کو ہی ظاہر کرتا ہے۔ مصنف کے تغیر مزاج کے مدارج کے حوالے سے یہ اقتباس لائق ذکر ہے:

> ''اللہ اللہ اس دور (جوانی) کا کبر و پندار، انانیت و خود پرستی! خوب یاد ہے کہ ایک بار جب بی۔اے کے آخری سال میں تھا اور کچھ مضمون انگریزی اور اردو کے رسالوں میں نکل چکے تھے۔ ایک روز غسل کر رہا تھا، ادھر جسم پر پانی ڈالتا جاتا اور دل ہی دل میں بڑبڑاتا بھی جاتا کہ خاندان والے جاہل میرے علم وکمال کو کیا جانیں اور میری قدر کیا پہچانیں!''
>
> استغفر اللہ، استغفر اللہ، صد نفریں اس رعونت پر، ہزار ملامت اس شیخی پر!'' (۷۶)

مذکورہ بالا اقتباس اس حقیقت کا مظہر ہے کہ خودنوشت نگار کی زندگی کتنے مختلف مراحل سے گزری ہے۔ انہوں نے کس طرح احساس کمتری سے احساس برتری کا سفر کیا ہے نیز آخر میں احساس ندامت کی منزل پر کیسے پہنچے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سارا سفر شدید نفسیاتی کشمکش کے سائے میں طے ہوا ہے۔

ماجد دریا آبادی کی جنسی اور ازدواجی زندگی بھی کشمکش سے عبارت ہے۔ یہاں اس پر کلام کرنے سے قبل یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ خودنوشت میں ایسا کوئی واقعہ مرقوم نہیں ملتا جو مصنف کی شدید جنسی رجحان اور بے راہ روی کی غمازی کرتا ہو، تاہم بلوغت سے ادھیڑ پن اور بندش وانقتاع کے دور سمیت ہم انکی زندگی میں جنس کے حوالے سے جذبۂ جنس کی طرف میلان اور خوف خدا کے ساتھ سماجی حدود کے باہم رساکش ہونے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ خودنوشت کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ انکی جنسی زندگی کا آغاز اس دور سے ہوتا ہے جب یہ ملحدانہ زندگی گزار رہے تھے، ماحول بھی جنسی آلودگی کا گہوارہ بنا ہوا تھا، لیکن یہاں سے خاندانی تربیت و شرافت اپنا غالب اثر دکھا رہے تھے، پھر جلد ازدواجی بندھن میں بندھ جانے اور اسکے فوراً بعد انکا اسلام کی طرف مراجعت کرنا ایسے اسباب ہیں جنہوں نے مصنف کو جنسی کج روی کے کیچڑ میں پھنسنے سے بچائے رکھا۔ مذہب سے وابستگی نے انہیں ضبط نفس بخشا اور انکی جنسی و ہیجانی کیفیت میں جس طرح کا فطری اُبال پہلے تھا وہ خودنوشت کے مطابق ٹھنڈا پڑتا گیا۔ چنانچہ اس حوالے سے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''عورت سے بھی طبعی شوق رکھتا تھا، قوت کا گھٹنا تو تقاضائے عمر سے ایک عمر طبعی ہے باقی اصل قابو تو اس پر جب سے آیا، جب سے از سر نو مسلمان ہوا۔'' (۷۷)

یہاں نفسیاتی رو سے اس چیز کو بھی قطع نظر نہیں کر سکتے کہ جنسی تجربہ کے حصول اور جسمانی تبدیلیوں کے رونما ہونے کا بھی اسکے پیچھے ہاتھ رہا ہے۔

ماجد دریا آبادی کی خودنوشت ''آپ بیتی'' کے حوالے سے اب ہم انکی آغاز جوانی کی جنسی کشمکش پر نظر ڈالتے ہیں جہاں یہ بات بخوبی مترشح ہوتی ہے کہ کس طرح مصنف ایک طرف اپنی جسمانی تبدیلی (ایڈ) اور ماحول کی وجہ سے برانگیختہ ہو رہے تھے تو وہیں دوسری جانب خاندانی شرافت وتربیت یا فوق انا اپنا اثر دکھا رہے تھے۔ ان کے آپسی ٹکراؤ سے جو کشمکش پیدا ہوئی، مصنف کی زبانی اسے ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

> ''عادات و کردار پر بڑا اثر ساتھ کے لڑکوں کا پڑتا ہے، اور اب کیا بتایا جائے کہ ساتھ کے لڑکے عموماً کیسے تھے، اسکولوں کا ماحول اب جتنا گندہ ہے، اس سے تو بہر حال کم، پھر بھی اسی نوعیت کا اس وقت بھی تھا، اور بعض لڑکے تو بہت ہی گ۔ گزرے تھے، کہنا چاہیے کہ ہر قسم کی خباثت و شیطنت کے پتلے، اور مسلمان لڑکے بھی اس صف سے الگ نہیں، ایک مشہور لڑکے کا شیطانی اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا، لیکن الحمداللہ بات زیادہ نہیں بڑھنے پائی، خانگی ماحول کی پاکیزگی کام آئی _____ محرم کے زمانے میں سیتا پور میں بھی خوب دھوم دھام ہوتی اور نویں محرم کو عورتوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں زیارت کے لئے نکلتیں۔ ایک ہندو لڑکے نے پٹی پڑھائی کہ وہ رات بڑی مزیدار ہوتی ہے، عورتوں کے جسم خوب مس کرنے کو مل جاتے ہیں، والد صاحب سے رات بھر گھومنے کی اجازت مانگی، نئی فرمایش پر اُنھیں حیرت ہوئی، لیکن بہر حال اجازت مل گئی۔ گھر سے چلا اسی شیطانی ارادہ سے لیکن طبعی شریفانہ جھجک آڑے آئی، ایک بار بھی ہمت نہ قدم آگے بڑھانے کی ہوئی نہ ہاتھ بڑھانے کی، جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس آ گیا _____ اسی ایک نمونے سے اندازہ میری حرکتوں کا کیا جاسکتا ہے۔''(۷۸)

خودنوشت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماجد صاحب کے لاشعور میں ان جیسے مواقع پر فوق انا کا سینسر عملاً غالب رہتا تھا لیکن ظاہر ہے ان خواہشات کا ارتفاع ہونا بھی قدرۃً لازمی تقاضا ہے اور اس کا دباؤ پھر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اس حوالے سے جب ہم خودنوشت میں انکی شادی کا ذکر پڑھتے ہیں تو ان میں انتہا درجے کی مسرت اور پُر جوش انداز کا اظہار پاتے ہیں۔ یہ رویہ فی

الحقیقت لاشعور میں ایڈ کی اس تسکین کا احساس ہے جس سے مصنف داخلی طور پر برسر پیکار رہے تھے۔ ذیل کے اس اقتباس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے:

''جمعہ، ۲/ جون ۱۹۱۶ء آج سے بڑھ کر مسرت کا دن زندگی بھر میں یاد نہیں پڑتا، ایک نشہ سا سوار تھا، خوشی سے اُچھلا اُبلا پڑتا تھا، کوئی فاتح بڑے سے بڑا ملک بھی فتح کر کے اس سے زیادہ نازاں ومسرور کیا ہوگا، جتنا میں آج تھا!......حضرت سلیمان ندوی نے پہلے جب مجھے دیکھا کہ سر پر ریشمی زرق برق صافہ کے ساتھ فاتحانہ انداز میں محفل عقد کی طرف جا رہا ہوں تو کہا کہ: ''غازی محمود سومنات فتح کرنے چلا ہے۔''(۷۹)

یہ فرحت وانبساط اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ اگر بروقت انہیں ایڈ کی تسکین کا سامان نہ فراہم ہوا ہوتا اور جنسی خواہش کو کوئی مناسب ومحفوظ راہ سماجی ضابطوں کی پابندی کے ساتھ نہ ملی ہوتی تو ماجد صاحب کی شخصیت میں ممکنہ طور پر تعمیریت کے بجائے تخریبیت آجاتی۔ اس دعوے کو تقویت خودنوشت میں کئی واقعات سے ملتی ہے جہاں انکے رویے میں فوق انا کی کمزوری اور ایڈ کے غالب آنے کی کیفیت میں شدید احساس محرومی اور کمتری کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں عین ممکن رہتا ہے کہ ایڈ اپنی قوت کو ظاہر کرے۔ چنانچہ ہم گزشتہ اوراق انکے ایک اقتباس کے حوالے سے انکی ازدواجی تعلق میں تاخیر کی وجہ سے شدید ہیجانی حالت اور برہمگی ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ایڈ کے غلبے کی حالت میں وہ بعض اوقات سادیت پرست بھی بن جاتے ہیں، جہاں وہ کسی اور کے احساسات کو ملحوظ نظر نہ رکھ کر، صرف اپنی ذات اور خواہش کو مقدم رکھتے ہیں۔ یہی انکے عقد ثانی کا بنیادی سبب بھی بنا۔ وہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''بیوی کے طویل زمانۂ حمل ومدت رضاعت کے باعث طبیعت ایک مدت سے ڈانواڈول رہا کرتی، یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء میں جب اپنی عمر کے اڑتیسویں سال میں تھی، منتشر خیالات مرتکز ہو کر ایک مرحوم دوست کی بیوہ پر جم کر رہ گئے۔''(۸۰)

ایسے برتاؤ کو ہم انکا Ego-Depletion کہہ سکتے ہیں یعنی جو خاص مقصد انکے پیش نظر اس حوالے سے تھا، جب اس جذبے کی تسکین حسب خاطر ومنشا نہیں ہو پائی تو ایسے میں دوسری شادی کی طرف خیال مرتکز ہونا دراصل اسی Frustration کا روپ تھا۔ دوسرا نکاح جیسا کہ ظاہر ہے جنسی تسکین کی حصول یابی کی خاطر کیا گیا تھا، لیکن انکا یہ عمل انکو کافی مہنگا پڑا، اس سے نفسیاتی کشمکش کا ایک اور باب وا ہو گیا اور انہیں

اس کا شاخسانہ بھی جلد ادا کرنا پڑا۔ انکی پہلی بیوی سے انکے تعلقات خراب ہوگئے، اور دوسری بیوی بھی توقع کے مطابق نہیں نکلی، نیتجتاً وہ اس انتشار کے متحمل زیادہ دیر نہیں ہو پائے اور جلد انہیں دوسری بیوی کے لیے طلاق کی راہ چننی پڑی۔ ذیل کا اقتباس انکی اس ازدواجی کشمکش کا آئینہ دار ہے:

''اور جوں ہی محفل (نکاح ثانی کی) برخاست ہوگئی، مجھے علم ہوا کہ ارے! انھیں (پہلی بیوی کو) تو اچھا خاصہ رنج ہے، ان کے آنسو نکل رہے ہیں! مگر اب کیا کروں؟ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا......اور اب ان محبوب (پہلی) بیوی کو جنھیں اختلاج تو پہلے ہی سے تھا، باقاعدہ دورے غشی اور تشنج کے ہسٹیریا کے سے پڑنے لگے! ہر وقت غصّہ میں بھری رہتی تھیں، کھڑے سے گر پڑتی تھیں اور سخت سخت چوٹیں کھاتی تھیں۔ میرے ہاتھوں کے جیسے طوطے اُڑ گئے گویا: ع

''اسد اور لینے کے دینے پڑ گئے!''

......خیر، یہ سب تو تھا ہی، ایک نئی تمام تر غیر متوقع صورت یہ رونما ہوئی کہ یہ جدید بیوی صاحبہ خود مجھی کو کسی اعتبار سے بھی پسند نہ آئیں، نہ صورۃً نہ سیرۃً، اور میرے اندازے و معیار سے بالکل ہی مختلف نکلیں، اور یہ انقباض اول دن سے پیدا ہو گیا تھا، جب تک میں نے ان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی، ان ناخوش گوار لیکن بڑے اہم جزئیات کی تفصیل امر لاحاصل اور علاوہ میرے قلم کے لئے باعث تکلیف ہونے کے ان بچاری کے لئے بجز باعث رُسوائی، اس لئے یہ ساری تفصیلات بالکل القط! خلاصہ یہ کہ چند مہینہ کا نباہ تو خیر لشتم پشتم ہو گیا، اور وہ بھی جب کہ اس مدت کا بڑا حصّہ ان کا اپنے میکہ ہی میں گزرا۔ اور اب کوئی صورت ہی ان کے ساتھ حسن معاشرت سے گزر کرنے کی نظر نہ آئی۔ مجبوراً آخری علاج سے، جس کا نام طلاق ہے کام لینا پڑا۔'' (۸۱)

اس کے بعد بھی اسکا منفی اثر یہ رہا کہ جب تک انکی پہلی بیوی زندہ رہیں، خوشگوار تعلقات کبھی اُستوار نہیں ہو پائے۔ اس بحران کے مساوی معاشی کشمکش بھی اعصاب کو جھنجوڑ رہی تھی، لہذا ایسی بحرانی صورت حال سے فرار کی خواہش انہیں کتب بینی کے ذریعے سے مذہب کی آغوش میں لے کے آئی۔ مولانا دریا آبادی نے خودنوشت میں اپنی ذہنی تشکیل کے پیچھے کتابوں کا کافی ہاتھ مانا ہے، اپنی زندگی پر کتابوں کے مطالعے سے پڑے گہرے اثر کا ذکر کرتے ہوئے، وہ ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

''ضلالت مطالعہ کے راستے سے پائی ،ہدایت بھی بحمداللہ اِس کی راہ سے نصیب ہوئی۔''(۸۲)

لیکن یہاں یہ بات دلچسپ ہے کہ قرائن کی روشنی میں انکا کفر وضلالت کے دلدل میں پھنسنا اور انکار خداوندی کا مرتکب ہونا کلیتاً مطالعہ کے زیر اثر ماننا درست نہیں رہے گا کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ان ملحدانہ کتب نے صرف انکی پہلے سے موجود انانیت وخود پرستی کے جذبہ کو مشتعل کر کے تقویت دی تھی۔اس بنا پے کہا جا سکتا ہے کہ انکار وارتداد کا یہ سفر دونوں عوامل کے سائے میں طے ہوا تھا۔خودنوشت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے آغاز جوانی میں ایسا بھی دور آیا جب انکا احساس برتری کا جذبہ اپنے آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔بطور مثال والدین کی نافرمانی،عزیزوں کی حق تلفی ،ماتحتوں پر ظلم وجبر اور اہلیہ کے تئیں حاکمانہ رویہ، ایسا طرز عمل مانا جاسکتا ہے جو خودسری کے دعوے کی تائید کرتا ہے لہذا انکا انکار خدا کرنا ایسی حالت میں تھا، جب اندر سے بھی وہ خود پرستی میں بہت حد تک مبتلا ہو گئے تھے۔انکا ایک شعر اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے:ع

''تھا زور کبھی خود بینی کا کرتے ہی کیا تھے ہم، ہم کے سوا
اور اب تو زبان پر کچھ بھی نہیں،رب اغفر وارحم کے سوا!''(۸۳)

مصنف سے ایسی حالت میں کیا کچھ صادر ہوا،اُسے یہاں قلم انداز کرتے ہوئے صرف نمونے کے طور پر ذیل کے اقتباس سے ان جمیع کشمکشوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو خود پرستی سے خدا پرستی کے سفر میں پیش آئی ہیں:

''زندگی بھر میں حق ادا کسی کے بھی کیا پایا ہوں ،بڑوں ،چھوٹوں ،برابر والوں میں شرمندگی نہیں کس سے ہے؟صفات ستاری وغفاری اگر آڑے نہ آجائیں تو حشر میں آنکھیں چار کر کے سامنا کسی ایک بھی سابقہ والے کا نہیں کرسکتا......احاطہ اور استقصاء اپنے ایسے مظلوموں کا کہاں کرسکتا ہوں۔''(۸۴)

اس اعتراف کو اگران کے ایک اور اقتباس کی روشنی میں بھی دیکھا جائے تو تصویر مزید صاف ہو کے سامنے آتی ہے:

''طبیعت عادی شروع ہی سے حکومت وحکمرانی کی ہوگئی،اور نفس کو چسکا بچپن ہی سے اپنی

بڑائی کا پڑ گیا۔ ساتھیوں سے احساس مساوات کا پیدا ہی نہ ہونے پایا۔"(۸۵)

اسکے بعد اگر انکی مذہبی کشمکش کی بات کی جائے تو انکے خاندان کے بارے میں اولاً یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان کا گھرانہ مروجہ تصوف سے کافی متاثر تھا۔ انکے والدین خانقاہی و درگاہی نظریات کے حاملین تھے۔ جسکے بارے میں مصنف کا یہ خیال ملتا ہے کہ گھر میں سنت کے بجائے بدعت کی پیروی ہورہی تھی، بہرکیف اس کا کسی حد تک اثر انہوں نے بچپن میں قبول کیا تھا۔ اور ۱۲، ۱۳ سال کی عمر تک وہ یا وہ مُلا ہی تھے لیکن کالج میں آتے ہی انکے خاندانی عقائد کی عمارت ڈھ گئی۔ وہاں بقول ماجد دریا آبادی کے نفسیات کی کتب نے انکے ایمان کو متزلزل کرنے میں سب سے زیادہ رول ادا کیا۔ اس وجہ سے تشکیک و کمتری کا احساس ان میں جنم لینے لگا۔ اس نئے چیلنج کے آگے تسلیم ہوتے ہوئے اور ہزیمت کی تلافی کے لیے وہ خود کو اب یہ تسلی دینے لگے کہ میں "عقل پسند" بن گیا ہوں۔ مصنف کی زبانی انکی اس کشمکش اور احساس کمتری کی تلافی کو ان سطور میں ملاحظہ کریں:

> "کالج کی زندگی میں قدم رکھتے ہی عقائد کی دنیا کہنا چاہیے کہ زیروزبر ہونا شروع ہوگئی، تفصیل تو ایک باب میں آئے گی یہاں سلسلۂ بیان میں بس اتنا سمجھ لیجئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس مسلمان قالب کا قلب باضابطہ مرتد ہوئے یا کوئی دوسرا مذہب قبول کئے اسلام اور ایمان سے یکسر خالی ہوگیا۔ یہاں تک کہ دو سال بعد شروع ۱۰ء میں جب انٹرمیڈیٹ کا فارم بھرنے کا وقت آیا تو مذہب کے خانہ میں بجائے مسلمان لکھنے کے "ریشنلسٹ" لکھ دیا۔"
> (۸۶)

انکے دہریت کی طرف مائل ہونے کے محرک پر ایک اور حوالہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے:

> "اسلام اور ایمان سے برگشتہ کرنے اور صاف وصریح ارتداد کی طرف لانے میں ملحدوں اور نیم ملحدوں کی تحریریں ہرگز اس درجہ موثر نہیں ہوئیں، جتنی وہ فنی کتابیں ثابت ہوئیں جو نفسیات کے موضوع پر اہل فن کے قلم سے نکلی ہوئی تھیں......دوسری کتاب میں اختلال دماغی اور امراض نفسیاتی کو بیان کرتے کرتے یک بیک وہ بدبخت مثال میں وحی محمدی کو لے آیا، اور اسم مبارک کی صراحت کے ساتھ ظالم لکھ گیا کہ مصروع شخص کے لئے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی بڑا کارنامہ دنیا کے لئے چھوڑ جائے!......ایمان کی بنیادیں کھوکھلی تو پہلے ہی ہو چکی تھیں! اب ان کم بخت "ماہرین فن" کی زبان سے اس قسم کی تحقیقات عالیہ

سُن کر رہا سہا ایمان بھی رخصت ہو گیا، اور الحاد و ارتداد کی منزل تکمیل کو پہنچ گئی!''(۸۷)

بہر حال! ماجد صاحب کے مرتد ہونے کے بعد بھی انکا ایک جذباتی تعلق دین اسلام کے ساتھ قائم رہا۔خودنوشت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب نئی اور عجیب کشمکش میں گرفتار ہوئے۔ وہ انکار خدا بھی کرتے اور ساتھ میں مذہب کا دفاع کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتے۔اس متضاد رویے کی نفسیاتی وجہ یہ سمجھی جا سکتی ہے وہ کبھی بھی مدمقابل کے آگے زیر نہیں ہونا چاہتے ہیں۔ وہ سامنے والے کی مخالفت میں اور اسکو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو منوانے کے لیے اور احساس برتری ظاہر کرنے کے لیے اپنی انا کو اس طرح تسکین دیتے ہیں۔اس حوالے سے انکا یہ بیان دلچسپ ہے:

''جذباتی حیثیت سے ایک حد تک مسلمان باقی رہ جانے کے سلسلے میں یہ لطیفہ سننے کے قابل ہے کہ کوئی غیر مسلم جب کبھی اسلام پر معترض ہوا، تو اپنا دل اس کی تائید وہم زبانی کو نہ اُٹھا بلکہ ارتداد کامل کے باوجود اس کے جواب دینے ہی پر آمادہ کرتا۔''(۸۸)

قریب دس سال تک کفر و الحاد اور بے دینی کے شکنجے میں جکڑے رہنے کے بعد اور زندگی کے ادوار کے بنیادی رجحانات سے گزرتے ہوئے نیز زمانہ کی ستم ظریفویوں کو سہتے ہوئے اب انکی زندگی میں ایک اور انقلاب آیا۔سابقہ دور کی انا نے اب وقت کے ساتھ مغلوب ہونے کا احساس اور اعتراف کرنا شروع کیا۔اس کے پس پردہ جہاں سابقہ تجربات کی مسلسل کڑیاں ہیں وہیں مطالعے اور صحبت نے اس بات کو ماننے کے لیے انہیں مجبور کیا، کہ محکومی و بندگی کے احساس کا قلادہ گردن میں ڈالنا ہی پڑے گا اور اپنی انا کی شکست تسلیم کرنی پڑے گی۔ اسکا یہ اثر ہوا کہ یہ سارے اُمور انکے ضبط نفس میں معاون بنے اور انکی تعمیری شخصیت نکھرنے لگی۔ اسکے بعد جو تعمیری کام ہم انکی طرف سے دیکھتے ہیں وہ اسی تبدیلی کی بدولت ہے۔اس حوالے سے جو اشخاص انکی شخصیت سازی میں معاون بنے، ان میں خاص طور پر مولانا محمد علی جوہر اور مولانا اشرف علی تھانوی کی کاوشوں کو ماجد دریا آبادی خودنوشت میں خود سراتے ہیں۔

یہاں مولانا دریا آبادی کی بے دینی کے اس خاص دور (جو دس سال پر محیط تھا یعنی عمر کے چھبیسویں برس تک) کو اگر ہم ماہر نفسیات ارک اریکسن کے نقطہ نگاہ سے بھی سمجھنے کی کوشش کریں تو انکی شخصیت کی گرہیں سمجھنے میں مزید مدد ملتی ہے۔اریکسن کے نظریہ Psycho Social Development

کے مطابق عمر کے بیس سے تیس سال تک کے عرصہ میں منفی کرایسس (crisis) کا حامل شخص احساس تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے، اور زندگی کے ساتویں مرحلہ، جو تیس سے ساٹھ سال کی مدت کا زمانہ ہوتا ہے میں مثبت کرایسس (crisis) میں گزرا شخص جمود کے بجائے سخاوت کا جذبہ رکھتا ہے۔ ماجد دریا آبادی کی زندگی کا چھٹا مرحلہ منفی و مثبت دونوں بحرانوں کا مرکب ہے۔ لیکن بعد کا مرحلہ مثبت کرایسس (crisis) پر مبنی ہے۔ اس لیے ہم عمر کے اس حصّے میں انکی طرف سے تعمیری و اصلاحی کام دیکھتے ہیں۔ خودنوشت میں انکا اصلاحی اسلوب و جذبہ دراصل سخاوت کے محرک کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا رجحان لیکن دوسری طرف سابقہ دور کی احساس کمتری و محرومی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

''آپ بیتی'' کا بیشتر حصّہ جو دنیا سے بیزاری، احساس ندامت، ماضی پرستی اور احساس تنہائی پر مبنی ہے وہ انکی نفسیاتی کشمکش کو ہی بیاں کرتا ہے اور آخر میں خدا سے شدید توقعات وابستہ رکھنا اور عفو و درگزر کی آس رکھنا اسی احساس کو مترشح کرتا ہے کہ وہ اس تھکا دینے والے ذہنی خلجان سے نجات پانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا کی خودنوشت سے اس آخر میں اس اقتباس کو پیش کیا جا رہا ہے جو انکے خواہش مرگ کو ایک طرف تو ظاہر کرتا ہی ہے لیکن ساتھ میں اس کے در پردہ اُس ذہنی کشمکش کو بھی آشکار کرتا ہے جس سے حتمی فرار اور سکون انہیں صرف موت میں نظر آتا ہے:

> ''بار ہا شوق مطالعہ کے آگے دوسرے طبعی جسمانی شوقوں کو مغلوب کر چکا ہوں، لیکن پھر بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس سے ہوتا کیا ہے، اور اس سے حاصل کیا، جب تک یہ دُھن تمام تر رضائے حق کی خاطر نہ ہو دنیا میں بالفرض اُردو کا نامی مصنف اور گرامی اہل قلم کہہ کر پکارا بھی گیا، تو حشر میں یہ القاب کیا نفع پہنچائیں گے، اور حیات ابدی کے حصول میں یہ کیا کام آئیں گے!......جب از سر نو مسلمان ہوا تو وہ (والدین) مرحوم راہی جنت ہو چکے تھے، رہے دوسرے اعزہ و احباب اور سابقہ والے، تو کسی کے بھی حق ادا نہ کر سکا۔ اور عبادت کا حال تو اور بھی ابتر۔ نمازوں میں بجز ٹکر لگانے کے اور کیا کیا، اور روزہ میں بجز بھوکا رہنے کے، اور حج بھی الٹا سیدھا، خدا معلوم کس طرح کر کے بس ایک چھتا سا اُتار آیا۔ غرض نہ اِدھر کا نہ ادھر کا۔ سوچتا ہوں کہ اپنا حشر کیا ہونا ہے۔...... بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد پرزور وصیت سارے ناظرین سے ہے کہ دنیا سے دل ہرگز نہ

لگائیں، اور اس کے مکر وفریب میں نہ آئیں جس کے صدہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن انسان بہر حال جسم و جسد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے، اس حکمت کی بھی رعایت رکھنا لازمی ہے......دیکھئے ابھی کتنی اور معیاد کاٹنا ہے، دل تو اُسی مژدہ جاں بخش کے سننے تڑپ رہا ہے کہ

ارجعی الیٰ ربك راضیةمرضیة فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی

اپنے حق میں تو بس ایک ہی اور آخری دُعا یہ ہے کہ بلاوا اس وقت آئے جب یہ ناکارہ اور آوارہ قلم، دین کی خدمت میں مشغول ہو، اور کسی عدو اللہ کے ہفوات کا جواب دے رہا ہو، یا اپنے محبوب کی کسی ادا کی معرفت کی دعوت دے رہا ہو! پڑھنے والے رُخصت! اس عالم ناسوت میں آخری سلام، ملاقات، بہ فراغت و اطمینان ان شاء اللہ بس اب جنت میں ہی ہوگی!''(۸۹)

اس اقتباس سے یہ روشن ہوتا ہے کہ مصنف اپنی زندگی کو جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ انکا سُپر ایگو (super-ego) آخری عمر میں انکی ایڈ (id) کو لے کے انہیں لاشعوری طور پر تعزیر دے کے ملامت کرتا ہے۔ پچھتاوے کا عمل اور احساس ندامت پر مبنی خودنوشت کا جو بیشتر حصّہ ہے وہ اسی کشمکش کی غمازی کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عبدالماجد دریا آبادی کی ''آپ بیتی'' خارجی معاملات کی کشمکش کی بہتات کے ساتھ ساتھ داخلی دنیا کی کشمکش پر مبنی وافر نفسیاتی مواد فراہم کرتی ہے، جو خودنوشت نگار اور اس زمانے کی نفسیاتی کشمکش کی گرہیں کھولنے میں اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے مزید براں انہیں بطور ادیب اور انکے ادب کی تفہیم میں بھی یہ خودنوشت نمایاں رول ادا کرتی ہے۔ اس طرح اس آپ بیتی کی اہمیت ہر اعتبار سے مسلم ہو جاتی ہے۔

حوالہ جات

(۱) جوش ملیح آبادی، یادوں کی بارات، روشناس پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۸، ص۳۱

(۲) ایضاً، ص۶۳

(۳) ایضاً، ص۱۳

(۴) پروفیسر احتشام حسین، ذوق ادب وشعور، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، باردوم ۱۹۶۳، ناشر ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔ ص۲۳۶

(۵) یادوں کی بارات، ص۳۱

(۶) ایضاً، ص۳۸،۳۹

(۷) ایضاً، ص۲۱

(۸) ایضاً، ص۔۱۰۰،۱۰۱،۱۰۲

(۹) ایضاً، ص۸۲،۶۸۱

(۱۰) ایضاً، ص۶۳۸

(۱۱) ایضاً، ص۱۹

(۱۲) ایضاً، ص۶۳۹

(۱۳) ایضاً، ص۹۱

(۱۴) ایضاً، ص۳۲۷

(۱۵) ایضاً، ص۳۲۷

(۱۶) ایضاً، ص۶۳۹

(۱۷) ایضاً، ص۳۰

(۱۸) ایضاً، ص۳۳۹،۳۴۰

(۱۹) ڈاکٹر گیان چند جین، تجزیے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۶۲
(۲۰) یادوں کی بارات، ص ۹۰، ۹۱
(۲۱) ایضاً، ص ۱۷۶
(۲۲) ایضاً، ص ۳۰۸
(۲۳) ایضاً، ص ۳۱۶
(۲۴) خورشید علی خان، ہمارے جوش صاحب، ذیشان کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۴
(۲۵) یادوں کی بارات، ص ۳۱۰
(۲۶) ایضاً، ص ۳۰۸
(۲۷) ایضاً، ص ۳۱۰
(۲۸) ایضاً، ص ۲۹۹
(۲۹) ایضاً، ص ۲۸۵
(۳۰) ایضاً، ص ۸۶۔۲۸۵
(۳۱) ایضاً، ص ۲۸۳
(۳۲) سگمنڈ فرائڈ، سراب کا مستقبل، مشمولہ فرائیڈی تناظر (مرتبہ تہذیب صدیقی)، براؤن پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۱۲، ص ۱۱۲
(۳۳) یادوں کی بارات، ص ۴۹
(۳۴) ایضاً، ص ۶۳۳
(۳۵) انور عارف، شورش کاشمیری، ص ۶۰
(۳۶) شورش کاشمیری، پسِ دیوارِ زنداں، ص ۱۲، مطبوعات چٹان لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۱۲
(۳۷) شورش کاشمیری، ''بوئے گل، نالہ دل دودِ چراغِ محفل''، مطبوعات چٹان لمیٹڈ، لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۱۹۵
(۳۸) ایضاً، ص ۱۱
(۳۹) ایضاً، ص ۱۱
(۴۰) ایضاً، ص ۱۰

(۴۱) ایضاً،ص۴۶

(۴۲) ایضاً،ص۴۸،۴۹

(۴۳) ایضاً،ص۴۴

(۴۴) ایضاً،ص۱۵،۱۶

(۴۵) ایضاً،ص۱۷

(۴۶) ایضاً،ص۲۱

(۴۷) ایضاً،ص۲۵

(۴۸) ایضاً،ص۳۵،۳۶

(۴۹) ایضاً،ص۴۴

(۵۰) ایضاً،ص۶۰

(۵۱) ایضاً،ص۲۳۵،۲۳۶

(۵۲) ایضاً،ص۹۶

(۵۳) ایضاً،ص۹۸،۹۹

(۵۴) ایضاً،ص۲۳۶

(۵۵) ایضاً،ص۲۳۶،۲۳۷

(۵۶) ایضاً،ص۴۳۶،۴۳۷،۴۳۸

(۵۷) ایضاً،ص۴۷۹

(۵۸) میاں امیرالدین،چٹان،شورش نمبر،۱۹۶۷،ص۱۵

(۵۹) بوئے گل......،ص۲۲۲،۲۲۳

(۶۰) اردو میں خودنوشت سوانح،ص۲۶۷

(۶۱) بوئے گل......،ص۱۹۱

(۶۲) مولانا عبدالماجد دریا آبادی،آپ بیتی،مجلس نشریات اسلام،کراچی،۱۹۹۶ء،ص۱۲

(۶۳) آپ بیتی،ص۲۸۲

(۶۴) عبدالماجد دریا آبادی، تحسین فراقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۳، ص ۴۳۱

(۶۵) آپ بیتی، ص ۱۴

(۶۶) ایضاً، ص ۲۳، ۲۴

(۶۷) ایضاً، ص ۱۸، ۱۹، ۲۳

(۶۸) ایضاً، ص ۹۳، ۹۴

(۶۹) ایضاً، ص ۶۱

(۷۰) ایضاً، ص ۳۴۶

(۷۱) ایضاً، ص ۳۵۰، ۳۵۱

(۷۲) ایضاً، ص ۳۶۲، ۳۶۳

(۷۳) ایضاً، ص ۸۵

(۷۴) ایضاً، ص ۶۳

(۷۵) ایضاً، ص ۹۰، ۱۸۹

(۷۶) ایضاً، ص ۱۵۵، ۱۵۶

(۷۷) ایضاً، ص ۳۴۷

(۷۸) ایضاً، ص ۱۰۸، ۱۰۹

(۷۹) ایضاً، ص ۱۷۶، ۱۷۷

(۸۰) ایضاً، ص ۱۹۱

(۸۱) ایضاً، ص ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴

(۸۲) ایضاً، ص ۲۵۵

(۸۳) ایضاً، ص ۱۵۶

(۸۴) ایضاً، ص ۳۶۰

(۸۵) ایضاً، ص ۸۵

(۸۶) ایضاً، ص ۱۱۹

(۸۷) ایضاً،ص۲۴۰،۲۴۱

(۸۸) ایضاً،ص۲۴۲

(۸۹) ایضاً،ص۳۷۹،۳۸۰،۳۸۱